Presentation Copy.

نثریات

ہارون خاں شروانی

ہدیہ محقق
مؤلف کی طرف سے
۲۵/۳/۱۹۷۶ء

نشریات

مؤلفہٗ

پروفیسر ہارون خاں شروانی

ایم اے (آکسن)، ایف آر ایچ ایس، بیرسٹرایٹ لا
صدر شعبۂ تاریخ وسیاسیات
جامعۂ عثمانیہ
حیدرآباد دکن

مطبوعۂ
اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز
حیدرآباد دکن

قیمت ۱۲ کلدار
عالی حالی

تقریب
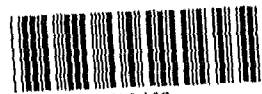
اس مجموعے میں اٹھارہ تقریریں جمع کی گئی ہیں جو حیدر آباد کے محکمۂ لاسلکی کی دعوت پر وقتاً فوقتاً کرتا رہا ہوں۔ جیسا معزز ناظرین کو احساس ہوگا، باوجودیکہ بعض موضوعات کافی دقت طلب ہیں، اس کا التزام رکھا گیا ہے کہ زبان آسان اور عام فہم ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جا سکے۔ ہر تقریر میں مسئلہ زیر بحث کا کوئی نہ کوئی نیا نقطۂ نظر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور چونکہ ہر پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے اس لئے ظاہری صورت حال کی تبدیلی پر بھی حقیقت حال کے سمجھنے میں دشواری محسوس نہ ہوگی۔ ہر تقریر کے ساتھ نشر کی تاریخ کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے تاکہ اس فضا کا اندازہ ہو سکے جس میں وہ تقریر نشر کی گئی تھی۔

ہ۔ خ۔ ش

حیدر آباد دکن
مارچ ۱۹۴۲ء

فہرست تقاریر

تاریخی اور تعلیمی فلمیں

(۲۴ رجولائی سنہ ۱۹۳۶ء)

ناظم صاحب نشرگاہ سرکار عالی نے مجھ سے فرمایش کی تھی کہ میں کسی تاریخی یا عام افادی موضوع پر اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کروں۔ بلاشبہ تاریخ ہند خصوصاً دکن کی تاریخ کے بے شمار حالات ایسے ہیں جن کا اعادہ ملک والوں کے لئے باعث عبرت یا باعث ہدایت ہوسکتا ہے، اور مجھے ایسے تاریخی واقعات کی اہمیت اور سبق آموزی کا جو احساس ہے اس کا بیان فضول ہے۔ لیکن میری دانست میں اس وقت جس ادارے کی طرف بہی خواہان ملک کی توجہ مبذول کرنی ضروری ہے وہ سینما کا ادارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں، اور موتی محل سینما کی آتش زدگی کے خوفناک اور اندوہناک حادثے کے باعث جس کے خیال سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

ہر فرد کی توجہ سینما کے ادارے کی طرف مبذول ہو گئی ہے۔ اور ملک کا ہر رکھنے والا دل اس طرف متوجہ ہو گیا ہے، جس سے امید بندھتی ہے کہ سینماؤں کا سیلاب شاید کچھ

رُک جائے اور جو سنیما اس وقت موجود ہیں وہ صرف اپنے درو دیوار ہی کی نہیں بلکہ اندرونی اصلاح کی طرف بھی متوجہ ہو جائیں۔ خود ہمارے بادشاہ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خسرو دکن کے حضور سے جو فرمان مبارک شرف صدور لایا ہے وہ نہ صرف حیدرآباد بلکہ تمام ملک ہندوستان کے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکتا ہے۔ موتی محل کے سانحہ سے متاثر ہو کر حضرت اقدس خسرو دکن خلد اللہ ملکہ نے ارشاد فرمایا کہ

> "آج کل کی دنیا میں سنیما کا جنون چوطرف کارفرما ہے، اور وہ تفریح کی حد سے بہت بڑھ چڑھ کر معلوم ہو رہا ہے۔ جو نہ صرف بلائے آسمانی کا باعث بن رہا ہے بلکہ مخرب عادات بھی ثابت ہو رہا ہے لہذا امید کی جاتی ہے کہ جو واقعہ کہ ظہور میں آیا ہے اس سے پبلک آیندہ کے لئے کافی سبق حاصل کر کے اپنے کردار و افعال کی درستگی کی طرف متوجہ ہوگی۔"

درحقیقت یہ فرمودہ ہمایونی ایسا ہے کہ دور دور تک اس کی اشاعت کی جائے اور ہر جوان بوڑھا، مرد، عورت اسے اپنا حرز جان تصور کرے۔

اس موقع پر سنیماؤں کی ظاہری اصلاح پر بحث کرنا مقصود نہیں اس لئے کہ اول تو اس بارے میں ہر اخبار میں بیسیوں خطوط چھپ چکے ہیں اور چھپ رہے ہیں اور دوسرے اس مسئلہ کے سلجھاؤ کے لئے سرکار عالی نے ہمارے ناظم صاحب کو توالی بالنفس صاحب کی صدارت میں ایک مامور یہ مقرر فرمایا ہے جس سے یقیناً نہایت مفید نتائج نکلیں گے۔ اس وقت میں جس موضوع پر عرض کروں گا وہ ایک خاص قسم کی فلموں کی نوعیت کا مسئلہ ہے۔ پانچ سال ہوئے عالی جناب ہز ایکسیلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنت

بہادر صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی نے ایک مجلس احتساب ناٹک و سنیما مقرر فرما کر تاریخی فلموں کے احتساب کا کام میرے تفویض فرمایا تھا۔ اس اعتبار سے پچھلے پانچ سال میں مجھے بہت سی تاریخی فلموں پر رائے دینے اور بعض کو تنقیدی نظر سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، اور جو کچھ آج عرض کروں گا اس کا بیشتر حصہ اسی زمانے کے عملی تجربہ پر مبنی ہے۔

بلا شبہ ایسی حکمیاتی ایجادات سے، جیسے سنیما اور لاسلکی ہیں، نہایت سہولت سے ملکی مفاد کا کام لیا جاسکتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ انہی ایجادوں سے ملک کے اخلاق کو پست اور پست تر بھی بنایا جاسکتا ہے۔ حقیقت میں جتنی بھی ایجادیں ہوتی ہیں ان میں سے اکثر کی یہی حالت ہے۔ تقریبًا ایک ہی قسم کی شعاعوں، گیسوں، برقی رؤوں اور آلوں سے انسان کو ہلاک کیا جاسکتا ہے اور اس کا علاج بھی کیا جاسکتا ہے؛ اسی طرح ایسی ایجادیں جن سے مختلف قسم کے ہیولات (جیسے تصویر، روشنی یا آواز) کے نشریات ایک وسیع رقبے میں ممکن ہوں، وہ ملک کے جذبات عالیہ اور اخلاق حسنہ میں ممد بھی ہوسکتی ہیں اور ان کے لئے مہلک بھی ثابت ہوسکتی ہیں۔ معزز سامعین میں سے بعض نے سر ٹامس ارنلڈ کا نام سنا ہوگا جو سر سید احمد خاں غفرلہٗ کے زمانے میں مدرستہ العلوم علیگڈھ کے معلّم فلسفہ تھے اور جو بعد میں چل کر جامعہ لندن کے معلّم عربی مقرر ہوئے۔ انھوں نے ایک موقع پر اپنی ایک تقریر میں بیان کیا تھا کہ کسی زمانے میں یورپ نے ایشیا سے علم حاصل کیا، اب ایشیا کو علم کی ضرورت ہے، اور وقت آگیا ہے کہ یورپ اسے یہ قرضہ واپس کردے۔ ہم یورپ کی اندھا دھند تقلید کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں، لیکن ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ یورپ نے اپنی خودداری، عزت و وقار قائم کرنے کی کیا کیا تدبیریں اختیار کی ہیں۔ یورپ والے تاریخی واقعات کی اہمیت کا صحیح احساس پیدا کرنا

خوب جانتے ہیں۔ جامعات کے دروس اور نصابی کتابیں تو علماء کے لئے ہوتی ہیں، عوام کے جذبات کو صحیح راستے پر ڈالنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے جاتے ہیں مجھے ولایت کے قصبہ سنٹ ایڈمنڈز میں ایک تاریخی مظاہرے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس نسبتاً غیر معروف مقام کی بظاہر واحد اہمیت یہ ہے کہ اس میں قدیم زمانے کے ایک بہت بڑے گرجا کے کھنڈر ہیں۔ لیکن تاریخ میں اس کی اچھی خاصی اہمیت ہے اور یہی وہ مقام ہے کہ جہاں شاہ انگلستان ایڈمنڈ کو اہل ڈنمارک نے تیروں سے چھید ڈالا تھا۔ وہ تاریخی مظاہرہ جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، نہایت بڑے پیمانے پر کیا گیا تھا، اور اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ اس مقام کی بھولی ہوئی تاریخ کو از سر نو زندہ کیا جائے، تاریخ انگلستان کے وہ تمام واقعات جو سنٹ ایڈمنڈز میں ہوئے تھے وہ سب ترتیب سے دکھائے جائیں تاکہ یہاں والوں کے دلوں میں خودداری اور دوسروں کے دلوں میں اس مقام کی عظمت کا احساس پیدا ہو جائے۔ اسی طرح مغرب میں جو تاریخی فلمیں تیار کرائی جاتی ہیں ان سے حالات ماضیہ کی تصویریں، ملکی اتحاد کے کارنامے، ملکی فتوحات اور ترقی کی کیفیات پوری طرح سے دل میں اتر جاتی ہیں، اور بعید ترین حالات کو کچھ اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ اس عہد کی بربریت اور غیر متمدن کیفیت پر پردہ پڑ جاتا ہے۔

مجھے خود اس قسم کی تمثیل میں ایک مرتبہ حصہ لینے کا اتفاق ہوا۔ بعض سامعین کرام کو علم ہوگا کہ جب ہماری جامعۂ عثمانیہ کی عمارت کے جائے وقوع کا مسئلہ زیر بحث تھا تو جامعۂ بمبئی کے معلم مدنیات پروفیسر گیڈیز (جو بعد میں چل کر سر پیٹرک گیڈیز ہو گئے) مشورے کی غرض سے یہاں بلائے گئے تھے اور یہی وہ تعمیر کار تھے جنہوں نے متعدد مقامات کا معائنہ کر کے اڈکمیٹ کو ترجیح دی تھی۔ آپ ہندوستان آنے سے پہلے جامعہ ایڈنبرا میں پروفیسر تھے ۱۹۱۱ء کا

ذکر ہے کہ انھوں نے جامعۂ لندن کی سرپرستی میں خاموش زندہ تصاویر کے ذریعے سے علوم وفنون کی ابتدا اور ترقی کا مظاہرہ کیا تھا جس میں مختلف جامعات انگلستان کے طلباء و طالبات نے اداکاری کی تھی۔ اس مظاہرے میں جسے "ترقی علوم" کے نام موسوم کیا گیا تھا' زوال روما سے لے کر اس وقت تک کے علوم وفنون کی درجہ بدرجہ ترقی کی کہانی زندہ تصاویر کے ذریعہ سے پیش کی گئی تھی۔ مجھے جس زندہ تصویر میں حصہ دیا گیا تھا وہ خلیفہ ہارون الرشید کا دربار تھا جس میں چین وماچین' ہندوسندھ فرنگستان واندلس کے سفراء کی آمد دکھائی گئی تھی' جو اپنے اپنے ملکوں سے طرح طرح کی ایجادات اپنے ساتھ لائے تھے اور انھیں اس زعیم ایشیا کے سامنے پیش کر رہے تھے اس میں میرے سپرد سفیر قرطبہ کی اداکاری تھی۔ تمام کھیل کے آخر میں ایک تاثر آفریں جلوس نکلتا تھا جس میں حلکیات کی دیوی بجلی کو قابو میں کئے ہوئے آگے ہوتی تھی اور پندرہ سو اداکار اور اداکارتیاں نہایت متانت سے اس کے پیچھے میں نے یہ قصہ اس لئے سُنایا کہ ایسی اداکاری اور اس قسم کے کھیل' بولتی تصویریں سنیما اور ناٹک ہی ہیں جو ملک کے لئے دلچسپ بھی ہو سکتے ہیں اور مفید بھی' اور ساتھ ہی ساتھ ان سے ملکی خودداری اور علم پروری میں مدد بھی مل سکتی ہے۔

تاریخی عظمت کو عوام الناس کے ذہن نشین کرنے کے اور بھی طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ بوڈیسیہ کے زمانہ کے برطانوی خواہ کتنے ہی غیر متمدن کیوں نہ ہوں' جب انسان اس مظلوم ملکہ کا نفیس مجسمہ لندن کے ایوان ہائے پارلیمنٹ کے روبرو دیکھتا ہے تو اُسے معًا یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ قیصری عہد کے برطانوی لوگ تمدن میں کچھ ایسے گئے گذرے نہ تھے۔ ہم یونانیوں اور اور ایرانیوں کے باہم جھگڑوں کا

حال تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں اور یونانی عظمت کی کیفیات اعلیٰ درجہ کی لاکھوں ڈالر قیمتی فلموں میں دیکھتے ہیں جن سے ہمارے ذہن نشین یہ بات کرائی جاتی ہے کہ تہذیب و علوم و فنون میں یونانی یکتائے روزگار تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے ایسے حالات نہیں چُنے جاتے کہ جن سے یونان کی تذلیل مقصود ہو بلکہ وہ کیفیات پیش کی جاتی ہیں جن سے یونان کی عظمت کا سکہ جم جائے۔ جب تمثیل نگار کا مقصد ہی یہ ہوا تو وہ ایسے واقعات کیوں چننے لگا جن سے یونانیوں کی عقلی یا اخلاقی پستی ظاہر ہوتی ہو مثلاً وہ واقعہ جب اسپارٹا کے ایک بادشاہ نے ایران و یونان کا نقشہ دیکھ کر (جسے ایرانی سفیر اپنے ہمراہ لایا تھا) سمجھا کہ ایران صرف چند منٹ یا چند گھنٹوں کی راہ ہوگی، یا سکندر اعظم کے بعد اخلاقی پستی کا وہ عہد جب محض ملکی اغراض سے قریب ترین محرمات کے درمیان مناکحت کا قاعدہ عام ہوگیا تھا اور شخصی ہوسناکی کے سامنے اخلاقی موانع کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ تصویر و تمثیل کے ذریعہ سے جو چیزیں نمایاں کی جاتی ہیں وہ ایسی ہوتی ہیں جن سے ملکی اتحاد، عظمت و خودداری کا ولولہ پیدا ہو نہ کہ ایسے واقعات جن سے ملک کی تخریب یا توہین کا جذبہ پیدا ہو۔ اور آپ یورپ کے گھروں، تفریح گاہوں، تماشہ گاہوں، سنیماؤں، مدرسوں اور جامعات سب ہی مقامات پر اسی اصول پر عمل دیکھیں گے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں پچھلے پانچ سال میں مجھے بیسیوں فلموں پر رائے دینے کا موقع ملا ہے۔ میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ملک میں جو نام نہاد تاریخی فلمیں بنائی جاتی ہیں ان کا اثر اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ ان فلموں کا موضوع عام طور سے تین میں سے ایک ہوتا ہے: یا ان میں بادشاہوں کے عیش و

عشرت، رقص و سرود، اصلی اور مفروضہ ہوسناکیوں کے سماں پیش کئے جاتے ہیں، یہ نہیں تو ہندوؤں، مسلمانوں، مرہٹوں، پٹھانوں، شمالیوں جنوبیوں کے سچے جھوٹے نفاق کے تذکرے دکھائے جاتے ہیں؛ ورنہ پھر بے نتیجہ بے سروپا انسانوں کو پیش کرکے انہیں تاریخ کا لقب دیا جاتا ہے۔ میں اس موقع پر تفصیل پیش کرنا بے سود سمجھتا ہوں۔ جن سامعین نے ہندوستان کی بنی ہوئی تاریخی فلمیں دیکھی ہیں وہ میرے اس قول کی داد دیں گے۔ کیا دوسرے ملکوں کی تاریخیں خانہ جنگیوں، ہوسناکیوں عیش و عشرت کی داستانوں سے نہیں بھری پڑیں؟ یونان، روما، فرانس، انگلستان سب ممالک کی تاریخوں میں ایسے مسلمہ واقعات ملیں گے جو ہمارے قلم نگاروں کے رشحِ قلم کو بھی شرما دینے کے لئے کافی ہیں لیکن آپ کو یورپ کی بنی ہوئی فلموں میں ایسے واقعات کا مشکل سے پتہ ملے گا اور ملے گا بھی تو زیادہ تر مقابلے کی خاطر۔ جہاں کہیں انسانوں کی آبادی ہوگی وہاں نیکی بھی ہوگی اور بدی بھی، لیکن یہ کیا غضب ہے کہ بدی کا نشر کیا جائے اور نیکی کو پس پردہ ڈال دیا جائے بلکہ کلیتہً محو کردیا جائے۔ ایسی فلموں اور تمثیلوں سے تو بجائے اس کے کہ ملک کی عظمت و توقیر دل نشین ہو، ملک اور ملک کی تاریخ سے نفرت کے جذبات موجزن ہونے کا اندیشہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ ایسے حالات سے بھری پڑی ہے جس سے باہر والے بھی سبق حاصل کرسکتے ہیں۔ محمد بن قاسم اور سندھیوں کے باہمی تعلقات محمود اور ملک ہندو کا اتحاد، شہاب الدین غوری اور بابر کا عزم و استقلال، شیر شاہ اور راجپوتوں کی دوستی، اکبر کا دربار، جہانگیر اور اس کی چہیتی ملکہ نور جہاں کی رفاقت، شاہ جہاں کی فن پروری، اورنگ زیب کا تورع اور اس کا اور مہاراجہ جے سنگھ کا

باہمی اعتماد، سیواجی کی فوج میں مسلمانوں کی بھرتی اور اس کا مسلمان عورتوں اور بچوں کے ساتھ سلوک، اور ایسے ہی سینکڑوں دوسرے واقعات ہیں جنہیں پردۂ سیمین کی اغراض سے پرو دیا جا سکتا ہے اور جو ہمارے دلوں میں ہمارے ملک کی عظمت وقار پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ پھر دکن کی تاریخ کا تو ایک ایک نقطہ یہاں کے فرمانرواؤں کی اولوالعزمیوں، سید القوم خادمھم کے اصول پر شاہانہ خدمت قومی، خودداری، فتح و نصرت سے بھرا پڑا ہے۔ خدا جانے کیوں ہمارے افسانہ نویس اور قلم نگاران خزانوں سے عوام کے دلوں کو مالا مال نہیں کرتے۔ بقول علامہ اقبال۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

سچ تو یہ ہے کہ علاوہ چند مستثنیات کے ہمارے ملک کی تاریخ اتفاق و اتحاد اور ترقی و تمدن کا ایک مرقع ہے اور جو بھی باہمی لڑائیاں ہوئی ہیں وہ عالمگیر نہیں بلکہ نہایت محدود رقبات میں اور محدود آبادی کے درمیان ہوئی ہیں۔

یہاں مجھے میسور کا ایک واقعہ یاد آیا۔ پچھلے دنوں جب ارباب جامعۂ عثمانیہ نے مجھے اپنی طرف سے اورینٹل کانفرنس میسور میں شرکت کا حکم دیا تو میسور میں اپنے فرائض سے فارغ ہو کر میں سلطان فتح علی خاں عرف ٹیپو سلطان کے مزار پر فاتحہ پڑھنے گیا اور اس کے بعد اس قلعہ کا چکر لگایا جس میں یہ شہید ملت لڑتا لڑتا مارا گیا تھا۔ ٹیپو کو متعصب کہا جاتا ہے اور اس کی مفروضہ ہندو آزاری پر اسے مطعون کیا جاتا ہے۔ لیکن سرنگا پٹم جاؤ وہاں اس سلطان کے زمانے کی صرف ایک مسجد

دیکھو گے تو چار سر بفلک مندر بھی پاؤ گے جو اس سلطان کی بے تعصبی کی زندہ یادگار آج تک موجود ہیں۔ ہمارا رہنما ایک میسوری ہندو لڑکا تھا۔ جب وہ انگریزوں کا قید خانہ دکھا کر باہر نکلا تو میں نے اس سے پوچھا کہ یہاں تم ٹیپو کو کیسا سمجھتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ صاحب! ٹیپو میں بُرائیاں بہت تھیں، لیکن ایک بھلائی ایسی تھی جس سے اس کی سب برائیاں ڈھک گئیں، وہ یہ کہ اس کے باپ نواب حیدر علی خاں کی وصیت پر وہ ہمیشہ عمل کرتا رہا۔ میں نے دریافت کیا وہ کیا وصیت تھی؟ تو اُس نے جواب دیا کہ واہ صاحب آپ کو نہیں معلوم! باپ نے بیٹے کو وصیت کی تھی کہ بیٹا ہندوؤں کی دل آزاری کبھی نہ کرنا، اور بیٹے نے ہمیشہ اس پر عمل کیا۔ کیا ایسے واقعات کو ہم اپنے افسانوں اور پردہ سیمین پر نہیں لاسکتے؟ خود دکن کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ پرچم آصفیہ کے زیر سایہ جو سلوک ہندو مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ رہا ہے وہ ضرب المثل ہے اور ملک کی ترقی و استحکام کے لئے جو انتظامات اس کے مؤسس اعظم حضرت آصف جاہ اول نے کئے اس کا ہی سبب ہے کہ جہاں دہلی برباد ہوئی اور لکھنؤ کا خاتمہ ہوا، وہاں دکن اللہ کے فضل سے اپنے بادشاہ ذی جاہ کے سایہ عاطفت میں دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔

ان سب باتوں سے مطلب صرف اتنا ہے کہ لوگوں میں خودداری اور ان کے دلوں میں اپنے ملک کی عظمت کی مُہر کرنے کے لئے ہمارے یہاں کافی مواد موجود ہے۔ صرف اس مواد کا استعمال کرنا شرط ہے۔ ہماری روایات شاہ پرستانہ اور وفادارانہ ہیں۔ ہم اپنے بادشاہ ذی جاہ کو صرف دکن ہی کا حکمراں نہیں بلکہ دہلی کی شہنشاہی روایات کا بھی حامل سمجھتے ہیں، اور شمالی ہند میں حضرت اقدس و اعلیٰ کی سیاحتوں کے

دوران میں شمالی ہندوالوں نے جس جوش و خروش کے ساتھ حضور پرنور سے اپنی جان
نثاری اور وفاداری کے جذبات کا اظہار کیا وہ در اصل اسی احساس کا ایک مظاہرہ تھا۔
ایسی فلمیں اور ناٹک جن سے خدانخواستہ شاہ پرستانہ احساس میں شمہ بھر بھی کمی ہو ملک
کے لئے سخت ترین نقصان کا باعث ہوگی، چنانچہ ہمیں نہایت چھان بین کر نام نہاد
تاریخی فلموں کی نمایش کی اجازت دینی چاہیئے۔ اس موقع پر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ
میری اس ناچیز کوشش میں نواب رحمت یار جنگ بہادر کوتوال صاحب
بلدہ اور یہاں کی تماشہ گاہوں کے مہتمم صاحبان نے ہمیشہ میرے ساتھ تعاون کیا ہے
نقصان رساں جھوٹی تاریخی فلموں سے ہمارے سنیما تقریباً پاک ہو گئے ہیں۔ اور اب
صرف وہی تاریخی فلمیں دکھائی جاتی ہیں جو ہمارے دلوں میں صحیح جذبات پیدا کریں
یہاں میں خاص طور پر دو ادارات کے نظماء سے کچھ استدعا کروں گا۔ معزز سامعین کو
اخبارات کے ذریعے سے معلوم ہوا ہوگا کہ خاص بلدہ فرخندۂ بنیاد میں ایک فلم
کمپنی کھولی گئی ہے جس کے نظماء میں نواب بہادر یار جنگ بہادر جیسے سنجیدہ اور محب
وطن اصحاب بھی شامل ہیں۔ دوسرے ہمیں یہ بھی علم ہے کہ حکومت حیدرآباد کو
بمبئی کی ایک فلم کمپنی یعنی "بمبئی ٹاکیز" سے بھی دلچسپی ہے، جو بعض نہایت دلفریب
فلمیں بھی تیار کر چکی ہے۔ میں کم از کم ان دونوں شرکتوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ
صحیح مذاق کی فلمیں تیار کریں اور یاد رکھیں کہ گو بغیر تھوڑی بہت چاشنی کے کوئی
چیز مزے دار نہیں ہوتی لیکن آج کل گھروں کی فضا، مدارس اور جامعات سے بھی
زیادہ فلم کمپنیوں اور نشر گاہوں پر ہمارے اخلاق کا دار و مدار ہے، اور اگر یہ دونوں
ادارات، جو سرکار عالی کے زیر سایہ کام کر رہے ہیں، فلموں کا صحیح مذاق پیدا کر سکیں گے تو

روپیہ اور محنت رائیگاں نہ جائیں گے۔

ایک اور قسم کی فلمیں ہیں جو ہندوستان میں کبھی پردۂ سیمین پر نظر نہیں آتیں اور جن کی یورپ میں بہت کچھ مانگ ہے۔ یہ فلمیں تعلیمی نوعیت کی ہیں۔ یورپ میں مشکل سے کوئی سنیما ہوگا جس میں مناظر قدرت اور پودوں اور جانوروں کی نشوونما کی تصاویر نہ دکھائی جائیں، مگر مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی یہاں اس نوع کی فلموں کا اشتہار بھی دیکھا ہو۔ اول تو ممالک بیرون ہند کے مناظر کی فلمیں منگاکر ان کا مذاق پیدا کیا جائے، پھر خود ہمارے ملک کے مناظر کی تصاویر لینے کا انتظام کیا جائے۔ اس میں کسے شبہ ہو سکتا ہے کہ بڑے بڑے تاریخی شہروں، بھانت بھانت کے باشندوں، پہاڑی دروں، کشمیری وادیوں، بندھیاچل اور دوسرے پہاڑوں کے راستوں، دکن کے مرغزاروں اور وسیع تالابوں کے مناظر نہایت دلچسپ ہوں گے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی کی تاریخ ایک طرح سے ملک ہند کی تاریخ کا نچوڑ ہے اور اس سرزمین کا ایک ایک چپہ تاریخی اہمیت سے بھرا ہوا ہے۔ شاید ہندوستان کے کسی صوبے میں مشکل سے اتنے مقامات گذری ہوئی سلطنتوں کے پائے تخت رہے ہوں گے جیسے ممالک محروسہ میں اور ان پائے تختوں میں سے دو یعنی دولت آباد اور اورنگ آباد تو تمام ملک ہند کے صدر مقام بھی رہ چکے ہیں؛ پھر بیدر و گلبرگہ، ورنگل و رائچور، ایلورا و اجنٹا اور خود بلدۂ فرخندہ بنیاد کی ایک ایک اینٹ ہمارے ملک کی عظمت کی یاد دلانے کے لئے کافی ہے یقیناً ایسے قدرتی مناظر اور تاریخی عمارات کی فلموں کا سلسلہ بنایا جائے تو مقبول بھی ہوگا اور مفید بھی۔ یہ تو صرف ممالک محروسہ کا ذکر ہوا۔ ذرا باہر نکلئے تو ہمارے سامنے جو تاریخی مقامات آئیں گے ان کا تنوع تو اتنا ہے کہ ان کی تصویریں لیتے لیتے ہماری فلم کمپنیاں

تھک جائیں گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ سننے والوں میں سے کوئی معزز صاحب کسی
فلم کمپنی کے ناظم یا مہتمم بھی ہیں یا نہیں؟ اگر ہوں تو ان سے عرض کرونگا کہ قدرتی مناظر
اور تاریخی مقامات کی متحرک تصویریں لینے کا دلچسپ ترین طرز یہ ہے کہ چلتی گاڑی
میں سے قدرتی مناظر کی اور متحرک آلۂ عکس سے تاریخی مقامات کی تصویریں لی جائیں
تاکہ نمایش کے وقت انسان تقریبًا وہی کیفیات محسوس کر سکے جو خود ان مقامات
میں جا کر کرتا ہے۔ مجھے ایک مرتبہ ایک سنیما میں جانے کا اتفاق ہوا جس میں محض
سیر و سیاحت اور مناظر قدرت کی تصاویر دکھائی جاتی تھیں۔ اور یہ تصاویر سب کی
سب چلتی ہوئی ریلوں یا گاڑیوں سے لی ہوئی تھیں۔ سنیما کا ہال بالکل ریل کے چوبچے
کی طرح بنا ہوا تھا اور کچھ ایسی ترکیب کی گئی تھی کہ فلم دکھانے کے وقت پورا ہال
ریل کے چوبچے کی طرح چلے تاکہ دیکھنے والوں کے دلوں میں وہی کیفیات پیدا ہوں
جو ریل میں بیٹھ کر دیکھنے میں ہوتیں۔ یہ ترکیب تو یہاں وقت طلب ہوگی لیکن
قدرتی مناظر اور تاریخی مقامات کی تصویریں اسی اصول پہ لی جائیں تو دلچسپ بھی
ہوں اور سبق آموز بھی۔

موالید ثلاثہ کی تصاویر بھی یورپ میں عام ہیں، اور یہ وہ تصاویر ہیں جن میں
مختلف قسم کے درختوں کی نشو و نما جانوروں کی پیدایش، آواز اور زندگی کے تمام حالات
دکھائے جاتے ہیں۔ میں نے ایسی فلمیں دیکھی ہیں کہ نظر کے سامنے بیج ڈالا گیا، وہ
اُگا، بڑھا، کلی پیدا ہوئی، پھول پتیاں نکلیں، پھل آیا، پکا اور توڑ کر کھا لیا گیا
یا پھر مختلف پرندوں کی بولیاں، ان کے گھونسلے، انڈے، بچے اور طرز سکونت کے
نظارے دکھائے گئے۔ ہماری یہ حالت ہے کہ ہم میں سے بہت کم ایسے ہوں گے

جنہیں خود اپنے دیس کے درختوں، چرندوں، پرندوں کے ناموں کا بھی علم ہوگا۔ یقین ہے کہ اگر کوئی حوصلہ مند شرکت ایسی نباتاتی اور حیواناتی فلمیں بنانے کا تہیہ کرلے تو مختلف جامعات کے شعبہ جات حیوانات خوشی سے ان کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ رہا مانگ کا سوال، تو اول تو ایسی فلمیں عامانیوں کے لئے بہت دلچسپ ہونگی اور دوسرے، صرف حیدرآباد میں ہی مانگ پیدا کی جائے، جہاں اب تو بعض سڑکوں پر دو دو تین تین سینما نظر آتے ہیں اور جہاں ہر روز دس پندرہ ہزار روپیہ ان کی نذر ہو جاتا ہے، تو فلم کمپنیوں کی توجہ اس طرف ضرور مبذول ہو جائے گی جب والٹر ڈزنی نے پنسل سے چوہا چوہیا بناکر ان میں گویا جان ڈال دی تو کیا ہم جیتے جاگتے جانوروں کو بولتا چلتا نہیں دکھا سکتے۔

اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے حضرت اقدس واعلیٰ اعلیٰ حضرت حکیم السیاست سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ کی درازی عمر و اقبال کی دعا کرتا ہوں۔ حضرت جہاں پناہی کی ہی سیاست و تدبیر کا طفیل ہے کہ ملک کو اتنی امن و امان، آسائش و مرفہ الحالی نصیب ہوئی ہے اور ہم میں طرح طرح کی حکمیاتی ایجادات سے فائدہ اُٹھانے کی اہلیت پیدا ہوگئی ہے۔
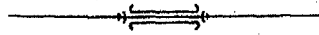
اڈریانوپل (ادرنہ)

(۸۔ اگست سنہ ۱۹۳۹ء)

اڈریانوپل کے نام سے ہمارے دلوں میں طرح طرح کے جذبات موجزن ہوتے ہیں۔ مشرقی یورپ کے اس شہر کو ترکوں نے سنہ ۱۳۶۱ء میں اپنی عظیم الشان سلطنت کا جو تین براعظموں میں پھیلی ہوئی تھی، پایۂ تخت بنایا اور اس سال سے لے کر فتح قسطنطنیہ تک یہ سلاطین آل عثمان کا پایۂ تخت رہا۔ گویا قسطنطنیہ کے پایۂ تخت بن جانے کے بعد اس کی حیثیت محض ثانوی رہ گئی تھی تاہم اس کی عظمت میں کم فرق آیا، اس لئے کہ یہ گویا قسطنطنیہ کا علم بردار اور اس کا محافظ تھا اور جتنی تجارت ترکی کے یورپی علاقوں مثلاً بلغاریہ، رومانیہ، سربیہ، ہنگری وغیرہ اور قسطنطنیہ یا استنبول کے درمیان ہوتی تھی وہ اسی شہر میں ہو کر گزرتی تھی لیکن سلطنت عثمانیہ کے ساتھ اڈریانوپل کو بھی زوال ہونا شروع ہوا۔ سب سے پہلے سنہ ۱۸۲۹ء میں روسیوں نے اس پر قبضہ کر کے گویا سنگینوں کے زور سے ترکوں کو مجبور کیا کہ وہ یونانیوں کو نام نہاد آزادی دیدیں اور اس خوشی کے مظاہرے کے طور پر وہ اس قدیم شہر کی مساجد کی قیمتی اشیا کو جن سے وہ بھری پڑی تھیں، لوٹ کر لے گئے اور بازاروں کو ویران کر دیا۔ سنہ ۱۸۷۸ء میں یہ پھر چند روز کے لئے روسیوں کے قبضے میں آیا، اور اس دفعہ انھوں نے سلطان محمد خاں

چہارم اور سلطان احمد خاں سوم کے محلات کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ ۱۹۱۲ء میں اس شہر پر بلغاریہ کے بادشاہ فرڈینینڈ کا قبضہ ہوا اور اس کو اپنی کامیابی پر اتنا زعم تھا کہ اس نے وہ دن بھی مقرر کر لیا جب وہ آگے بڑھ کر استنبول پر قبضہ کرے گا اور لاثانی مسجد آیا صوفیہ پر عیسوی صلیب نصب کرے گا، جس میں سلطان محمد خاں فاتح نے یکم جون ۱۴۵۳ء کو سب سے پہلے جمعہ کی نماز ادا کی تھی۔ اسی جنگ میں اڈریانوپل کا وہ قابل یادگار محاصرہ ہوا جس میں غازی شکری پاشا اور ترکی فوج نے فاقے کرنا پسند کیا لیکن ذمیوں یعنی سلطان کی عیسائی رعایا کے مویشیوں اور ان کے اناج کے کھلیانوں پر ہاتھ ڈالنے سے بالکلیہ احتراز کیا۔ اس واقعہ کو علامہ اقبال مرحوم و مغفور نے حسب ذیل موثر نظم میں ظاہر کیا ہے:-

یورپ میں جس گھڑی حق و باطل کی چھڑ گئی — حق خنجر آزمائی پہ مجبور ہو گیا
گرد صلیب گردِ قمر حلقہ زن ہوئی — شکری حصار درنہ میں محصور ہو گیا
مسلم سپاہیوں کے ذخیرے ہوئے تمام — روئے امید آنکھ سے مستور ہو گیا
آخر امیر عسکرِ ترکی کے حکم سے — "آئینِ جنگ" شہر کا دستور ہو گیا
ہر شے ہوئی ذخیرۂ لشکر میں منتقل — شاہیں گدائے دانۂ عصفور ہو گیا
لیکن فقیہہ شہر نے جس دم سنی یہ بات — گرما کے مثلِ صاعقۂ طور ہو گیا
ذمی کا مال لشکر مسلم پہ ہے حرام — فتویٰ تمام شہر میں مشہور ہو گیا
چھوتی نہ تھی یہود و نصاریٰ کا مال فوج — مسلم خدا کے حکم سے مجبور ہو گیا

اورنہ پر اغیار کا آخری قبضہ جنگ عظیم کے بعد ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک رہا جب اس شہر کے سیاہ و سفید کے مالک وہی یونانی ہوئے جو سو برس پہلے تک ترکوں کی

رعایا تھے، اور یہ غازی عصمت پاشا ہی تھے (جو اب بائے عصمت انونو کے نام سے صدارت جمہوریت ترکیہ کے فرائض ایسی کامیابی سے انجام دے رہے ہیں) جنہوں نے لوزان کانفرنس میں اس تاریخی شہر کو اغیار کے گڑھے ہوئے پنجے سے رہا کرادیا۔

الغرض اڈریا نوپل یا ادرنہ کے نام سے ہمارے دلوں میں طرح طرح کے خیالات امنڈ آتے ہیں، اور جب حکومت اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خسرو دکن خلد اللہ ملکہ کی عنایت سے مجھے سال گذشتہ یورپ جانے کا موقع ملا تو میں نے تہیہ کر لیا کہ میں اس تاریخی شہر کی ضرور زیارت کروں گا۔ ہم نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ۵ رجولائی کو رات کے آٹھ بجے استنبول کو خیرباد کہا۔ یہاں یہ بتانا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اڈریا نوپل ترکی کے ان پانچ شہروں میں سے ہے جن کو اب نہ صرف یہ کہ ترک یورپی نام سے نہیں پکارتے بلکہ وہ خود یوروپیوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ انھیں ترکی کے نام ہی سے پکاریں اور رسل و رسائل میں ترکی نام ہی استعمال کریں۔ یہ شہر استنبول (قسطنطنیہ) ادرنہ (اڈریا نوپل) ازمیر (سمرنا) طرابزون (ٹرے بی زونڈ) اور انقرہ (انگورہ) ہیں اور اب سنجق ہاتائے کے قبضے کے بعد بلاشبہ اسکندرونہ (الگزینڈریٹا) کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے گا۔ ادرنہ کا معاشی بلکہ سیاسی مقاطعہ کرنے کی اس سے بہتر کیا ترکیب ہو سکتی ہے کہ جو واحد ریل کی پٹری اس تاریخی شہر اور ترکوں کے سابق پایۂ تخت استنبول کو ایک دوسرے سے ملاتی ہو اس کا ایک حصہ یونان کے حوالہ کر دیا گیا ہو اور شہر کو تین طرف سے بلغاری اور یونانی سرحدوں سے گھیر لیا گیا ہو۔ گو روسیوں، بلغاریوں، یونانیوں، اور بین اقوامیوں کے قبضے کی وجہ سے اور معاشی اعتبار سے اس کا گلا گھونٹ جانے کی وجہ سے اس کی آبادی تیس سال کے

اندر کئی لاکھ سے گھٹ کر صرف چند ہزار نفوس رہ گئی ہے تاہم اب بھی اس کی قدیم تاریخی عظمت باہر سے آنے والے کی نظروں کے سامنے کچھ اس طرح سے نمایاں ہوتی ہے جیسے کوئی طلائی زیور مٹی میں پڑا ہوا اپنی چمک دمک سے آنکھوں کو خیرہ کر رہا ہو۔ حال میں جب سے جمہوریہ قائم ہوا ہے ادرنہ کو صوبہ تھریس کی تعلیم و تربیت کا مرکز بنا دیا گیا ہے اور اس میں متعدد تحتانی، وسطانی اور فوقانی مدارس کی تعمیر سے اسے بہت کافی امتیاز حاصل ہو گیا ہے۔

ہماری ریل یکایک یونانی حدود سے نکل کر قراغاچ کے عظیم الشان خوبصورت نئے اسٹیشن پر رکی جو ادرنہ سے دو میل کے فاصلہ پر ہے۔ گو خاص" ادرنہ شہر" کا ایک اور اسٹیشن ہے لیکن اکثر لوگ قراغاچ پر ہی اتر جاتے ہیں۔ اسباب وغیرہ اتارنے اور محصول خانے سے فراغت تک اسٹیشن پر جو گاڑیاں تھیں وہ سب جا چکی تھیں جس کی وجہ سے ہمیں تقریباً ایک گھنٹہ تک رکنا پڑا۔ باوجودیکہ ترک ظاہری تمدن کے اعتبار سے بالکل یورپی بن گئے ہیں تاہم ان میں اب بھی پرانی ایشیائی مدارات کا جذبہ بھرا ہوا ہے۔ اسٹیشن کے پولیس کے افسر اعلیٰ خالد افندی نے ہم پر بے حد مہربانی کی، چائے پلائی، موٹر کے لئے ٹیلیفون دیا اور گاڑی آنے تک برابر اپنے دفتر میں مہمان رکھا۔ یہی کیفیت اسٹیشن کے دوسرے عہدے داروں کی بھی تھی، خصوصاً اسٹیشن ماسٹر بہت ہی معذرت خواہ تھے کہ مسافر کمرہ کی مرمت ہو رہی ہے اور اس لئے آپ کو کافی آرام نہیں پہونچ رہا۔ یوں تو ادرنہ میں کئی ہوٹل ہیں لیکن غالباً سب سے زیادہ شہرت ایک چھوٹے سے ہوٹل کی ہے جسے پہلے "ہوٹل ڈیلیوٹر" کہتے تھے لیکن اسے اب کوئی اس نام سے نہیں پہچانتا بلکہ اس کا ترکی نام "اردو پا اوتیلی"

ہی لیا جاتا ہے۔ اس ہوٹل کا نام بڑا اور شن چھوٹے ہیں۔ مالکہ جرمن یہودن ہے جو اپنے آپ کو عیسائی ترکن کہتی ہے۔ کھانا بالکل ترکی لیکن استنبولی ہوٹلوں سے ناقص اور قیمت میں مہنگا۔ خیر ہمیں تو صرف دو ہی دن ٹھہرنا تھا اس لئے صبر کیا۔

حالیہ ویرانی کے سبب سے ادرنہ کے بعض حصوں پر ایک عجیب حسرت سی برستی ہے شہر کے بعض حصے مثلاً محلہ بایزید ایسے ہیں جن کی مساجد خصوصاً جامع مسجد (جس کی تعمیر ۱۴۸۸ء میں ہوئی تھی) حمام، شفا خانے، مدارس، فوجی بارگیں، مکانات سب موجود ہیں لیکن آبادی محض برائے نام رہ گئی ہے جامع مسجد کے امام نے مجھ سے کہا کہ یہ محلہ جنگ عظیم تک گنجان آباد تھا اور مسجد میں سینکڑوں نمازی ہوتے تھے لیکن جنگ عظیم کے بعد یہ بالکل اجڑ گیا اور اب اس کی آبادی پانچ چھ سو سے زیادہ نہیں۔ مسجد کے روبرو ہی قبرستان، جس میں لاکھوں شہدا آرام کی نیند سو رہے ہیں، اس خطے کی پرانی کروفر اور حق پرستی کی یاد تازہ کرتا ہے۔

شہر ادرنہ کی سب سے ممتاز عمارت سلطان سلیم خان ثانی کی بنائی ہوئی مسجد ہے جس کے چار عظیم الشان مینارے میلوں سے، یہاں تک کہ یونان اور بلغاریہ کے علاقوں ہی سے نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک فرانسیسی محقق کا یہ قول صداقت پر مبنی ہے کہ اس عظیم المرتبت مسجد سے ترکی قوم کے حقیقی خصائص کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے مرمریں ستون، مرمریں وضو خانے، اس کا عظیم الشان دروازہ جو سبز سنگ مرمر کے ستونوں پر کھڑا ہے، اس کی محیر العقول پچی کاری اور چینی کے کام، اس کی اعلیٰ درجہ کی جالیاں، یہ سب چیزیں اس عالی منش دور کی یاد تازہ کرتی ہیں جب ادرنہ سلاطین آل عثمان کا پایۂ تخت تھا۔ اس کے حجم کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اس کے

واحد بڑے گنبد کے نیچے کم و بیش بیس پچیس ہزار نفوس بیک وقت خدائے واحد
کی عبادت کر سکتے ہیں۔

مسجد سلیمیہ ادرنہ کا گویا تاج ہے اور یہ اپنے چار نازک بلند میناروں کی
وجہ سے دور سے واقعی تاج معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری نفیس مساجد
اور عمارتوں سے ادرنہ بھرا پڑا ہے۔ مثلاً مسجد مرادیہ کو سلطان مراد خاں ثانی نے
سنہ ۱۴۲۰ء میں بنایا تھا اور عسکی جامع یا قدیم جامع کو قسطنطنیہ کی فتح سے دو سال پیشتر
محمد خاں فاتح نے تعمیر کیا تھا۔ حماموں، شفاخانوں، سراؤں، اور بازاروں کے علاوہ
مرتضیٰ طفجہ اور آردا نامی دریاؤں پر (جو ادرنہ کے قریب ایک دوسرے سے مل جاتے
ہیں) سلاطین آل عثمان نے دس پل بنائے جو سب کے سب نہایت مضبوطی اور
استقامت کے ساتھ اس وقت تک قائم ہیں۔ علاوہ ازیں سلاطین کے محلات کے کھنڈر
اور فاتح کی عدالت گاہ بھی اپنے گذرے ہوئے زمانے کو آٹھ آٹھ آنسو رو رہے ہیں۔

سفر میں بعض عجیب عجیب تجربے ہوتے ہیں۔ خیال کیجئے کہاں دکن
اور کہاں اس کی تاریخ سے ادرنہ کا تعلق۔ میں سلیمیہ میں مغرب کی نماز پڑھ کر ہوٹل
آنے کے لئے گاڑی میں بیٹھ رہا تھا کہ مسجد کے پیش امام صاحب، جو صورت و شکل
میں سرخ و سفید اور بالکل ٹھیٹھ یورپی اور مذہباً پکے مسلمان تھے، میرے پاس آئے
نہایت تپاک سے مصافحہ کیا اور دریافت کیا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے
حیدرآباد کا ذکر کیا تو انھیں اس سے بڑی دلچسپی ہوئی اور کہا کہ گو میں آپ کی
زبان نہیں بول سکتا لیکن مجھے آپ کے ملک سے نسلی تعلق ہے۔ انھوں نے
یہ عجیب بات کہی کہ وہ میرتاش پاشا، جنھوں نے ادرنہ کو چودھویں صدی میں فتح

کیا در اصل سلطان علاء الدین خلجی فاتح دکن کی اولاد سے تھے اور خود یہ امام صاحب جن کا نام خلیل زہدی ہے، انہی دمیر تاش پاشا کی نسل سے ہیں۔

دوسرا اس سے حیرتناک واقعہ یہ تھا کہ جب ہم شام کے وقت اپنے ہوٹل میں داخل ہوئے تو ہمارے کمرے کے سامنے ایک نوجوان لڑکے نے ہمیں سلام کیا اور ذرا کھڑی اردو میں بے تکلف گفتگو کرنی شروع کردی۔ ہمیں سخت تعجب ہوا کہ کہاں ہندوستان کہاں یورپ کا یہ دور افتادہ خطہ یہاں اردو جاننے والا کون ہو سکتا ہے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ ان کا نام عبدالعزیز ہے۔ اصل میں کاشغر (چینی ترکستان) کے رہنے والے ہیں، ہندوستان میں بھی رہے ہیں، عمر سولہ سترہ سال کی ہوگی، ترکی حکومت سے وظیفہ پاتے ہیں اور فوقانیہ مدرسہ میں شریک ہیں۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ترکی حکومت وسط ایشیا والوں کو جن کی مادری زبان ترکی ہو، خواہ وہ چینی رعایا ہوں یا روسی، غیر ملکی تصور نہیں کرتی بلکہ ان میں سے کوئی ترکی آئے اور سیاسی اعتبار سے مشتبہ نہو تو اسے ہر طرح کی تعلیمی امداد دیتی ہے، تعلیمی وظیفہ عطا کرتی ہے اور خدمات ملکی میں اس کے لئے جگہ مہیا کرتی ہے، بلکہ فوج تک میں لے لیتی ہے۔ غازی انور پاشا مرحوم ومغفور نے تو ایک تورانی سیاسی فریق بنانے کی کوشش کی اور اس میں ناکام کیا ہوئے، اپنی جان تک دیدی، موجودہ ترکی جمہوریہ ایک دوسرے راستے سے اپنے دور افتادہ نسلی بھائیوں سے رشتۂ اخوت جوڑنا چاہتی ہے اور اس میں ایک حد تک کامیاب ہو رہی ہے۔ عبدالعزیز کہتے تھے کہ چینی ترکستان کی پچھلی جنگ آزادی میں ان کے باپ بھائی ہی نہیں بلکہ ماں بہنیں بھی سب کی سب چینیوں کے خلاف جہاد میں شریک تھے

اور ان میں سے بعض کام بھی آئے، اور ترکمانوں میں آپس میں پھوٹ نہ پڑ جاتی تو وہ یقیناً آزاد ہو جاتے۔

باوجودیکہ یہ نسبت استنبول کے ادرنہ کا وسطی یورپ سے زیادہ گہرا تعلق ہے تاہم اس میں استنبول سے کہیں زیادہ ترکیت اور مشرقیت پائی جاتی ہے۔ یہاں کی اکثر عورتیں استنبول سے زیادہ مشرقی طریقوں کی پابند ہیں اور (بے نقاب ہی سہی) اب تک قدیم طرز کا سیاہ برقعہ پہنتی ہیں۔ لڑکے لڑکیاں ابھی تک پرانی سیدھی سادی وضع میں بناؤ سنگھار بغیر نظر آتی ہیں اور کم سے کم مجھے بازار میں کوئی شراب کی دوکان نظر نہیں پڑی۔ خدا سے دعا ہے کہ اس شہر پر ترکی جھنڈا ہمیشہ اڑتا رہے؛ آج کل تو یہ چاروں طرف سے اغیار کے نرغے میں ہے۔

۱۷ جولائی کی صبح کے وقت ہم نے ادرنہ اور ترکی کو خیرباد اور خداحافظ کہا۔ صبح ساڑھے چھ ہی بجے عبدالعزیز بھی آ موجود ہوئے اور چونکہ ان کی مادری زبان ترکی تھی۔ اس لئے ان سے چلتے وقت بہت مدد ملی۔ یونانی سرحد کا نشان قراغاج کے اسٹیشن ہی سے نظر آنے لگتا ہے اور آناً فاناً ہماری ریل ترکی عملداری چھوڑ کر یونان میں داخل ہو گئی۔

چین کا تمدن

(۱۵ ۔ نومبر ۱۹۳۹ء)

چار پانچ برس سے چین اور جاپان کی باہمی کشمکش اس شدت سے جاری ہے کہ ان دونوں ملکوں کے نام ہر شخص کی زبان پر ہو گئے ہیں اور مشکل سے کوئی دن جاتا ہو گا کہ چینیوں کی بے مثال قربانیوں اور ان کے رہنما چانگ کائی شیک کے حالات اخباروں میں نہ پڑھے جاتے ہوں۔ براعظم ایشیا کی وسعت اور اس کے فاصلوں کے بُعد کی وجہ سے بہت کم اہل ہند کو اس کا علم ہو گا کہ ہندوستان اور برما کی سرحد چین کی سرحد سے ہزاروں میل تک ملی ہوئی چلی گئی ہے اور مدت دراز سے ان دونوں ملکوں کے مابین ایک دوسرے سے تعلقات چلے آ رہے ہیں۔ نہ صرف قرب کے باعث بلکہ مذہبی اعتبار سے بھی چین اور ہمارے ملک میں بہت کچھ رابطہ ہے، اس لئے کہ ایک طرف تو چینیوں کا ایک معتد بہ حصہ ہندوستانی مذہبی رہنما مہاتما گوتم بدھ کے پیروؤں پر مشتمل ہے اور دوسری جانب یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ جتنے مسلمان چین میں پائے جاتے ہیں اتنے کسی دوسرے ملک میں نہیں ملتے۔ بہرحال ان روابط سے آگاہ ہو کر یہ نہایت مناسب ہے کہ ہم اپنے ہمسایہ

ملک کے تمدن سے تھوڑے بہت واقف ہو جائیں۔

اگر منچوریا منگولیہ تبت اور چینی ترکستان کو چین میں شامل سمجھا جائے تو اس ملک کا رقبہ ہندوستان سے دوگنا بلکہ اس سے زائد ہی ہوگا چین کی آبادی تقریباً نصف ارب ہے اور اس کی بابت مشہور چین شناس پروفیسر جائلز لکھتے ہیں کہ اگر تمام چینی آبادی ایک قطار میں ہو کر کسی جگہ سے گذرنا شروع ہو تو یہ دلچسپ جلوس قیامت تک کبھی بھی ختم نہ ہوگا اس لئے کہ قبل اس کے کہ موجودہ پشت کا آخری آدمی مقررہ مقام سے ہو کر گذرے ایک نئی پیڑھی پیدا ہو کر بڑی ہو چکی ہوگی اور اب وہ گذرنی شروع ہو جائے گی۔

پیداوار کے اعتبار سے چین کا نمبر دنیا کے تمام ممالک سے پہلے آتا ہے اور یہ تاریخ حالیہ کا ایک نہایت ہی دردناک پہلو ہے کہ ترکی کی طرح چین کو کبھی اتنے دن آرام سے بیٹھنے نہیں دیا جاتا کہ وہ اپنی خام پیداوار اور قدرتی وسائل سے کما حقہٗ کام لے سکے۔ دنیا بھر کے چاول کا ۶۰ فی صدی چار کا ۵۰ فی صدی ریشم کا ۲۵ فی صدی اسی ملک میں پیدا ہوتا ہے۔ کوئلہ بھی بافراط پیدا ہوتا ہے اور تقریباً ۱۲ کروڑ من لوہا ہر سال برآمد ہوتا ہے۔ لیکن باوجود اس عظیم الشان پیداوار کے چین کی اکثر خام اشیاء جاپان اور دوسرے ملکوں کو بھیجدی جاتی ہیں، وہاں سے میکانیکی طریقوں سے شکل بدل کر واپس آتی ہیں اور چینیوں کی دولت کو صنعتی ممالک کی طرف کھینچ لے جاتی ہیں۔

چین کی تاریخ دنیا کے دوسرے ملکوں کی تاریخ سے نوعی طور پر مختلف ہے۔ دوسرے ملکوں کی قدیم تاریخ جاننے کے لئے ہمیں روایات کتبات اور دفینوں سے مدد لینی پڑتی ہے لیکن چین کی چار ہزار برس کی مکمل تحریری تاریخ بلا کم و کاست موجود ہے۔

اگر ہم اس تاریخ پر جستہ جستہ غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ کس طرح یہ ملک صدیوں بلکہ ہزاریوں پہلے تہذیب و تمدن میں اپنے ہم عصر ممالک سے آگے بڑھ گیا تھا۔ حضرت مسیحؑ سے تقریباً تین ہزار سال پیشتر ہی ملک میں ایک باضابطہ حکومت قائم ہو چکی تھی اور ایک وزیر نے جس کا نام یو تھا نو وزرا کی ایک کابینہ مقرر کی تھی جس کے ارکان وزیر مساحت، وزیر زراعت، وزیر قوانین، وزیر افادۂ عامہ، وزیر مراسم، وزیر موسیقی، وزیر خارجہ، اور وزیر اسپان، ہوتے تھے۔ آپ نے سنا کہ اس فہرست میں سب سے پہلا نام وزیر مساحت کا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کے دریاؤں میں ہمیشہ طغیانی آنے کے سبب آبادی کے ایک بڑے حصہ کی زندگی اس پر موقوف ہے کہ ان دریاؤں پر کسی نہ کسی طرح قابو رکھا جائے اور ملک کی پیمائش کر کے کوشش کی جائے تاکہ کم سے کم رقبہ اراضی زیر آب رہے۔ اسی وجہ سے چین کے ابتدائی زمانے ہی میں علم ہندسہ کو فروغ پہونچ چکا تھا اور جب آج سے چار ہزار برس پہلے کوان کا بیٹا وزیر مساحت مقرر ہوا تو اس نے بندوں، پلوں اور کشتیوں کی مدد سے نہروں کو چوڑا اور گہرا کیا، دلدلوں کے پانی کو چھوٹے چھوٹے نالوں میں نکالا اور ان نالوں کو دریاؤں میں بہا دیا۔ چین کے قدیم شہنشاہ اپنی رعایا کے اخلاق کی درستی کا بہت خیال رکھتے تھے، اور ہم پڑھتے ہیں کہ کس طرح دوسری ہزاری قبل مسیحؑ میں ایک بادشاہ چنگ تانگ نے اپنے امرا سے مخاطب ہو کر حسب ذیل زرین اصول کا اظہار کیا "لوگو سنو! اپنی خود غرضی غرور اور غفلت کو دور پھینکو۔ میں ہر خاص و عام کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ خواہ میرا قریب ترین عزیز ہی کیوں نہ ہو اگر اس نے جرم کیا ہوگا تو اسے اس کی سزا ضرور دی جائے گی۔ میں یہ تم پر اچھی طرح واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ قوم کی بہتری تم ہی

لوگوں کے متفرد اور مجتمع ہاتھوں میں ہے۔ اگر اس پر مصیبت آئی تو اس کا اغلب سبب یہ ہوگا کہ غلط راستے پر چلنے والوں کو میں نے کیفر کردار کو نہیں پہونچایا اور برائی کو بڑھنے دیا۔ میری تم سب سے التجا ہے کہ جال کے پھندوں کی طرح یکساں اور یکجا ہو جاؤ تاکہ تم ایک ہو کر ملک کو آگے بڑھا سکو نہ کہ ایک دوسرے سے بچھڑ کر پراگندہ ہو جاؤ اور ملک کی ترقی میں رکاوٹیں پیدا کرو۔"

چین کے ذکر کے ساتھ ہی اس کی عجیب و غریب زبان کا خیال بھی آتا ہے آپ لوگوں نے بعض انگریزی دواؤں کے ڈبوں میں جو اشتہار ہوتے ہیں ان میں ایک زبان ایسی دیکھی ہوگی جو بجائے دائیں سے بائیں یا بائیں سے دائیں کے اوپر سے نیچے کی طرف چھپی ہوتی ہے۔ یہی چینی زبان ہے۔ بعض سامعین کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس زبان میں حروف کا پتہ نہیں بلکہ ہر لفظ کے لئے ایک جداگانہ نشان مقرر ہے اور ذرا مبالغے کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر لفظ کے لئے حروف کا مرکب نہیں بلکہ ایک ایک حرف ہے، جس کے معنے یہ ہوئے کہ چینی میں تیس پینتیس نہیں بلکہ ہزاروں حروف ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ الفاظ کی شکل کو آواز سے مطلق کوئی تعلق نہیں اور ممکن ہے کہ پڑھا لکھا شخص بھی کوئی نیا لفظ یعنی حرف دیکھے لیکن اس کا تلفظ ادا نہ کر سکے۔ یہ نقوش کئی طرح کے ہیں (۱) تشکیلی نقوش جیسے چھوٹے سے دائرے کے اندر ایک موٹا نقطہ لگا دیا، سورج ہو گیا؛ (۲) تعمیری نقوش جیسے آڑی لکیر پر کھڑی لکیر بنائی اوپر کا تخیل ظاہر ہو گیا، اور اس کے برعکس نیچے کا تخیل؛ (۳) تشکیلی اور تعمیری نقوش کو ملا دیا اور نئے معنے پہنا دئے، جیسے خودی اور حاکم کے نقوش ملا دئے شہنشاہ ہو گیا؛ (۴) تضادی نقوش جیسے ایک ہی نقش سیدھے ہاتھ کی طرف کو

موڑ دیا' دائیں کے معنے ہو گئے' الٹے ہاتھ کی طرف کو موڑ دیا' بائیں بن گیا! (۵) استعاری
نقوش جیسے تیر کے نقش کو سیدھے یا پیچ کے معنے پہنائے! (۶) باقی ماندہ نقوش کو
صوتی کہتے ہیں۔ ان کی تعداد کم و بیش بیس ہزار ہے اور یہی وہ نقوش ہیں جن سے
چینی زبان گویا بنی ہے۔ ان کی بابت مشکل یہ آ پڑی کہ ایک چینی صرف ..۵ مختلف
آوازیں نکال سکتا ہے اور ان نقوش کے جامد ہونے کی وجہ سے مرکب آوازیں ممکن
نہیں ہوتا یہ ہے کہ کسی نئے مفہوم کے لئے دو یا دو سے زیادہ نقوش لکھے جاتے ہیں
لیکن تلفظ صرف ایک ہی نقش تک محدود رہتا ہے تاکہ زبان کی یک رنگی حیثیت
قائم رہے۔ (۷) محض آواز کے اتار چڑھاؤ سے بھی ایک ہی لفظ کے کئی کئی معنے
نکل سکتے ہیں۔ یہ بات خود ہماری زبان کی مماثلت سے سمجھ میں آ جائے گی۔ ہمارے
یہاں ایک معمولی لفظ "نہیں" ہے اس لفظ کے معنے کسے معلوم نہیں۔ لیکن اگر
سوال کے طور پر استعمال کیا جائے (نہیں؟) تو لہجہ ایک ہوتا ہے تعجب کے لئے
(نہیں!) بالکل جداگانہ! حکم کے لئے (نہیں) اس سے بھی الگ۔ غرض آواز کی اونچ
نیچ سے بھی الفاظ کے معنے بدل سکتے ہیں' اور چینیوں نے اس طرز عمل سے بہت
کچھ فائدہ اٹھایا ہے۔

چینی زبان پڑھنے لکھنے کی حد تک یقینی مشکل ہے اتنی ہی طباعت کے
اغراض کے لئے شاید آسان بھی ہے اس لئے کہ اس میں ابتدائی' وسطی' انتہائی
شکلوں' جوڑ توڑ' بڑے چھوٹے حروف کا سوال ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں
طباعت کی دریافت سے سیکڑوں سال پہلے چین میں چھاپے کا رواج ہو چلا تھا'
اور چونکہ چھاپنے کے لئے کاغذ کی بہتات کی بھی ضرورت ہے اس لئے کاغذ کی ایجاد کا

سہرا بھی چینیوں کے ہی سر ہے۔ سب سے ابتدائی چینی تحریریں بانس کے ٹکڑوں پر نظر آتی ہیں، اس کے بعد سوتی اور ریشمی کپڑے پر نقوش بنائے جانے لگے، اور پہلی صدی ق م جیسے بعید زمانے ہی سے پرانے کپڑوں، درختوں کی چھالوں اور گھاس کے گودے سے کاغذ تیار ہونے لگا۔

شاید دنیا کے کسی ملک میں اتنی مذہبی رواداری یا مذہبی تغافل نہیں پایا جاتا جتنا چین میں، اور اس ملک کی طویل تاریخ میں کبھی یہ سننے میں نہیں آتا نہ کبھی کسی اخبار میں پڑھا جاتا ہے کہ چینیوں نے محض ذاتی مذہبی عقیدے کی خاطر خون کی ندیاں بہائی ہوں۔ اس وقت چین میں پانچ مذاہب رائج ہیں۔ سب سے پہلے بودھ مت کو لیجئے جو پہلی صدی ق م ہندوستان سے چین پہونچا۔ تاریخ ہند کا مبتدی بھی مشہور چینی سیاحوں فاہیان، ہیون تسانگ اور اینسنگ کے ناموں سے واقف ہوگا جنھوں نے مہاتما گوتم بدھ کے آثار دیکھنے کی خاطر ہندوستان کی سیاحت کی اور اس زمانے کی ہندوستانی معاشرت کی ایک زندہ تصویر چھوڑ گئے۔ تاؤ مذہب کا بانی مشہور فلسفی لاؤتزے ہے جو ۶۰۴ق م میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے فلسفے کا لب لباب خاکساری ہے۔ اس کا ایک مشہور قول ہے کہ جو جانتا ہے وہ بتاتا نہیں، جو بتاتا ہے وہ جانتا نہیں۔ اس کا خیال تھا کہ ہر شخص، ہر جانور اور ہر چیز کی ایک خاص طرز زندگی اس کے ساتھ مخصوص ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اس راستے کو دریافت کریں اور اس پر چلیں تاکہ ہم فلاح پائیں یہی حقیقی تاؤ یا راستہ ہے۔ اسلام کے پیرو جتنے چین میں ہیں اتنے کسی دوسرے ملک میں نہیں اور اندازہ کیا گیا ہے کہ اس وقت ساڑھے سات کروڑ چینی مسلمان ہیں۔ اس ملک میں جن بزرگ نے سب سے

پہلے اسلام کی تبلیغ کی انہیں یہاں والے "واکس بابا" کہتے ہیں، اور اس وقت بھی
ان کا مزار شہر کینٹن میں مرجع خاص و عام ہے۔ کہتے ہیں کہ واکس بابا رسول اکرم صلعم
کا پیام لے کر شہنشاہ چین کے پاس گئے تھے اور وہاں اتنا اثر پیدا کیا کہ جب ان کا
انتقال ہوا تو شہنشاہ نے ان کے مقبرے پر خود اپنے خرچ سے مسجد بنوائی۔ چوتھا
مذہب عیسویت ہے۔ یوں تو مغول خاندان بلکہ اس سے بھی پہلے سے عیسائی پادری
چین میں آتے رہے لیکن سولھویں صدی سے پہلے اس مذہب کو کوئی خاص کامیابی
نہیں ہوئی۔ اس صدی میں ہندوستان کی طرح یوروپیوں نے چین میں بھی تجارت
کا جال پھیلایا لیکن آزادانہ تبلیغ کی اجازت ۱۸۶۰ء ہی میں ملی۔ اس وقت چین میں
کم و بیش نصف کروڑ عیسائی آباد ہیں۔

لیکن ان میں کے کسی ملک نے چین میں اتنے حلقہ بگوش نہیں پیدا کئے
جتنے کنفیوشیس کے مسلک نے، اور روحانی اعتبار سے یہ مشہور ہادی چینیوں کی سب سے
زیادہ تعداد پر حاوی ہے۔ کنفیوشیس ۵۵۱ ق م میں پیدا ہوا اور تین ہی سال کی عمر میں
اس کے باپ نے اپنے چہیتے بیٹے کو مدرسہ میں داخل کر دیا جہاں اس نے تعلیم و تربیت
دونوں میں ایک خاص امتیاز حاصل کیا۔ وہ بچپن ہی سے ہر چیز کا گہرا مطالعہ کرنے کا
عادی تھا۔ مدرسہ چھوڑنے پر اس نے موسیقی اور تیر اندازی میں کمال حاصل کیا اور
تیس سال کی عمر میں وہ علوم مروجہ سے کما حقہ واقف ہو گیا۔ یہ زمانہ چین میں بڑی
افراتفری کا زمانہ تھا اور اب کنفیوشیس نے اپنا مقصد حیات یہ قرار دیا کہ کوئی ایسا
طرز کی دریافت کرے جس سے ملکی نظام زندگی خرابیوں اور برائیوں سے پاک صاف
ہو جائے۔ اس کا ستارہ اس وقت چمکا جب اس نے پڑھانے کا پیشہ اختیار کیا اور

معلم کی حیثیت سے اس کی شہرت دور دور تک پہونچ گئی۔ ۷۲ سال کی عمر میں یہ سیاست دان، فلسفی، مورخ، ملک اور قوم کا پیشوا اور ہزاروں کا مشفق استاد اِس دنیا سے گذر گیا۔

کنفوشیس حقوق العباد کو پانچ تعلقات کے ضمن میں تقسیم کرتا ہے یعنی شہنشاہ و رعایا، باپ بیٹے، شوہر بیوی، چھوٹے بڑے، اور دوست دوست کے درمیان تعلقات اس نے خلق اللہ کے ساتھ بھلائی پر بہت زور دیا ہے اور اس کا مشہور مقولہ ہے کہ ایسے رہو کہ تمھاری زندگی دوسروں کے لئے باعث رحمت ہو۔ وہ کہتا ہے کہ شہنشاہ اپنی رعایا کے لئے بمنزلہ ایک باپ کے ہے اور حکومتی عمال کا ایک دوسرے سے برادرانہ تعلق ہوتا ہے۔ بادشاہ عزت و اطاعت کا اسی وقت حقدار ہے جب وہ رعایا کی بہبود کو اپنا فرض قرار دے۔ اس کے نزدیک ہمیں نیکی نیکی ہی خاطر کرنی چاہیئے نہ کہ کسی منفعت کی خاطر ورنہ وہ نیکی نہیں بلکہ عاقبت اندیشی ہو جائے گی۔ وہ کہتا ہے کہ اگر سرگروہ خاندان نیکی کی مثال ہو تو خاندان کے جملہ افراد نیک بن جائیں گے اور اسی طرح اگر بادشاہ خود اپنی ذات کی حد تک صحیح العمل ہو تو رعایا بغیر کہے اپنے فرائض کو انجام دے گی۔

اس کا قول ہے کہ بادشاہ کی حالت ہوا جیسی ہے اور رعایا کی کیفیت گھاس کی مانند۔ گھاس کی فطرت ہے کہ ہوا کے اشارے پر جھک جاتی ہے اسی طرح اگر بادشاہ نیک منش ہوگا تو رعایا خواہی نخواہی اس کی عادات کی اتباع کرنے پر مجبور ہوگی۔

دنیا کے تمام ممالک میں شاید چین ہی ایسا ہے جو باوجود طرح طرح کے مصائب کے سیکڑوں برس سے ابتک ہمیشہ آزاد رہا ہے اور یہ وہ ملک ہے جس نے اپنے اپنے رہنما

کنفوشیس کی تعلیمات کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اس پر عمل کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

قدیم ہندوستانی تمدن

(۱۷ نومبر ۱۹۳۹ء)

مختلف عہدوں اور زمانوں میں کسی ملک کی تقسیم اور ان زمانوں کے حدود قائم کرنا ایک دشوار مسئلہ ہے۔ خصوصاً ایسے ملک کی تقسیم اور تاریخی حد بندی نہایت دشوار ہے جس کے باشندوں کے بموجب یہاں کی تاریخ کروڑوں برس پرانی ہے۔ کہتے ہیں کہ ست یگ ۱۷ لاکھ ۲۸ ہزار سال کا، ترتیا یگ ۱۲ لاکھ ۹۶ ہزار سال کا، دواپر ۸ لاکھ ۶۴ ہزار سال کا، اور کل یگ (یعنی زمانہ حال) ۴ لاکھ ۳۲ ہزار سال کا ہوتا ہے۔ اور کل یگ کے بعد یہ دور از سرِ نو شروع ہو جاتے ہیں۔ ان اعداد و شمار میں حقیقت کا پہلو یہ ہے کہ جدید حکمیات کی رو سے ازل سے دینوی کیفیات میں برابر ارتقا ہوتا رہا ہے اور قدیم کی حد بندی نہیں کی جا سکتی۔ ایک اور غیر متوقع سمت سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ روایت ہے کہ حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت آدمؑ سے پہلے کون تھا؟ جواب ملا کہ آدم! اس شخص نے تین مرتبہ یہی سوال کیا اور ہر مرتبہ یہی جواب ملا، اور بالآخر حضرت علیؓ نے اس سے فرمایا کہ میاں! اگر تم تیس ہزار مرتبہ یہی سوال

کروگے تو یہی جواب پاؤگے۔

بہرحال قدیم کے تعین کا مسئلہ نہایت دشوار ہے۔ اور قدیم ہندوستان کے تمدن کی ابتدائی کیفیتیں اور اس کا ارتقا پندرہ منٹ میں بیان کرنا محال۔ اس عہد میں متعدد نمایاں ادوار گذرے ہیں جن میں ہمارے اس ملک نے بڑی بڑی ترقیاں کیں اور اطراف عالم میں مشہور و معروف ہو گیا، اور اس وقت جب مغربی دنیا جہالت کی تاریکی میں مبتلا تھی ہمارے وطن والوں نے مشکل سے کوئی ایسا علم ہوگا جس میں اس زمانے کے اعتبار سے اعلیٰ ترقی نہ کی ہو۔ یہاں میں ایک مسئلہ کی طرف سننے والوں کی توجہ چاہتا ہوں۔ خود ہمارے ہی دیس کے بعض خوش عقیدہ لوگوں کا یہ ڈھنگ پڑ گیا ہے کہ وہ پرانے زمانہ کے واقعات کو آج کل کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں اور موجودہ تمدن ہی کو تہذیب اور شائستگی کا اعلیٰ معیار سمجھتے ہیں آج کی بات چیت میں اس پر بحث کی گنجائش نہیں کہ آیا موجودہ تمدن واقعی انسان کے لئے مائۂ ناز ہے بھی یا نہیں۔ وہ تمدن جس کے مظاہرے ملکی حرص و آز ہوں جہاں دشمن کے ساتھ واحد سلوک اس کا بیج ناس کھو دینا ہو، جس میں پرانی کہانیوں کی مثل کہ فلاں حکمراں نے زن و بچہ کو کھو میں پسوا دیا صادق آتی ہو، جہاں کمزوروں کو غلام بنانے اور زیردست قوموں کی غلامی برقرار رکھنے پر فخر کیا جاتا ہو، ایسا تمدن کہاں تک بنی نوع انسان کی سچی خدمت کر سکتا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ موجودہ تمدن نے ہمیں ریل، تار، لاسلکی دئے ہیں اور دنیا کو سکوڑ کر ایک چھوٹے سے پیمانے میں بند کر دیا ہے، لیکن ابھی یہ مسئلہ طے نہیں ہوا کہ یہ چیزیں نعمتیں ہیں یا لعنتیں۔ بہرحال یہ کہنا بڑی غلطی ہے کہ محض اس لئے کہ ہندوستان میں ریل تار نہ تھے، پارلیمینٹ نہ تھی،

جرمن نمونے کے مکان نہ تھے، موٹریں نہ تھیں (جن کے پٹرول کی قیمت اور وجود پر ہمارے آرام و آسائش کا دارومدار ہے) اس لئے قدیم ہندوستان متمدن نہ تھا۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا کے ہر واقعہ پر جغرافی، تمدنی، مذہبی، سیاسی، نسلی، قومی، معاشرتی، انفرادی، غرض بیسیوں سینکڑوں قسم کے اثرات پڑتے ہیں اور تاریخ بے شمار مقدمات اور ان گنت نتیجوں کا گویا ایک مجموعہ ہے، پھر ہم کیونکر بغیر اپنے آپ کو گویا اس دور میں رکھے ہوئے محض آج کل کے غلط معیار کی اندھی عینک لگا کر فوراً قدیم زمانہ پر حکم لگانے کے قابل سمجھنے لگتے ہیں اور تعصبانہ انداز سے اپنے پرانے تمدن کو ایسی کسوٹی پر پرکھتے ہیں جو خود ابھی پرکھے جانے کی محتاج ہے۔

ہندوستان کا عہد قدیم اس اہم واقعے پر ختم ہوتا ہے جب ان قوموں نے جو پانچ سو برس پہلے سے ہندوستان کے شمال مغرب اور مغرب کی طرف سے حملہ کر رہی تھیں، خود اس جاذب ملک کو اپنا ملک بنا لیا اور ۱۲۰۶ء میں سلطان قطب الدین ایبک نے سلطنت دہلی کی بنیاد ڈال دی۔ اس طول طویل عہد میں سے ہم ایک دور لیں گے اور اپنے دیس کی تمدنی حالت کا خاکہ بنانے کی کوشش کریں گے۔ یہ عہد حضرت مسیحؑ سے ایک ہزار برس پہلے کا عہد ہے۔

حضرت مسیحؑ سے ایک ہزار برس پہلے کی دنیا کی حالت پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ابھی یہودی قوم دنیا میں منتشر نہیں ہوئی اور اس کی سلطنت شام و فلسطین میں موجود ہے۔ شاہ بخت نصر نے ابھی انھیں وہ نقصان نہیں پہنچایا جو ان کی سیاسی یکجہتی کے لئے زہر قاتل نکلی۔ چین میں ابھی کنفوشیس نے اپنی تعلیم کا جھنڈا بلند نہیں کیا اور مصر کی آزاد سلطنت فراعنہ ابھی موجود ہے۔ ایشیا میں بہت سی

نئی سلطنتیں قائم ہو رہی ہیں۔ اشور کا ستارہ بلند ہو رہا ہے، جاپانیوں کی طویل تاریخ کے ابتدائی مناظر سامنے آرہے ہیں، بابل اپنا سکہ جما رہا ہے۔ یہ حالت تو مشرق کی ہے۔ مغربی براعظم یعنی یورپ میں ہمیں گھٹا ٹوپ اندھیرا نظر آتا ہے جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ گلستان عالم میں جگہ جگہ پھول لہلہا رہے ہیں اور رنگا رنگ کے جانور ادھر ادھر مستانہ وار جھوم رہے ہیں، لیکن یورپ اپنی حیات کے محض ابتدائی مراحل طے کر رہا ہے، اور اسے اپنے پڑوسیوں کا اتنا بھی علم نہیں کہ جب ایک ایشیائی یونانی اسپارٹا کے بادشاہ کے پاس سے ایران کے خلاف مدد لینے کے لئے آتا ہے تو اسپارٹا کا بادشاہ صرف نقشہ دیکھ کر یہ سمجھتا ہے کہ ایران یونان سے چند گرہ کی دوری پر ہوگا!

یہ عہد ایشیا کے دوسرے ملکوں کی طرح تمدن ہند کی تاریخ میں بھی نہایت درخشاں نظر آتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب علوم و فنون کی مختلف شاخوں میں ہندوستانیوں نے انتہائی مہارت حاصل کرلی؛ جب اس ملک میں صرف و نحو، صوتیات، عروض، ہندسہ، جبر و مقابلہ، منطق اور فلسفہ میں آج کی طرح صرف نقال ہی نہیں بلکہ موجد پیدا ہوئے؛ جب اس کی مصنوعات کی وجہ سے چار دانگ عالم سے اس میں دولت کھینچی آنے لگی۔ پہلی ہزاری قبل مسیح میں اس ملک کی ترقی سے یونانی میگاس تھینس جیسے جہاں دیدہ شخص کی آنکھیں بھی چوندھیا گئیں اور ہندوستان کی ایک سلطنت یعنی مگدھ نے اتنی قوت حاصل کرلی کہ اس نے یونانی فوجوں کو جو پنجاب پر چھائی ہوئی تھیں ملک سے نکال دیا۔

ہندوستان میں ابتدائی زمانہ میں جو کچھ بھی علمی یا فنی ترقی ہوئی اس کا ماخذ

یہاں کی مقدس کتابیں یعنی وید ہیں۔ پوجاپاٹ کے اوقات مقرر کرنے کے لئے ستاروں کا علم سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ اجرام فلکی میں سب سے نمایاں اور ممتاز جسم جس میں ایک طرح سے تمام جانداروں کی طرح گھٹاؤ بڑھاؤ ہوتا رہتا ہے چاند ہے اور وقت کی تقسیم اور تعین کا چاند سے آسان ذریعہ ملنا دشوار ہے۔ ہر قمری مہینے میں چاند ستائیس یا اٹھائیس دن مختلف حالتوں میں نظر آتا ہے۔ اس لئے قدیم زمانے کے ہندوستانیوں نے آسمان کو اتنے ہی نچھتروں یعنی قمری منزلوں میں تقسیم کیا۔ لیکن اس میں دقت یہ پیدا ہوئی کہ مختلف موسم جو بظاہر سورج کی لیکن درحقیقت زمین کی رفتار کا نتیجہ ہوتے ہیں، مقررہ قمری اوقات پر نہیں آتے تھے بلکہ ہمیشہ ہٹتے رہتے تھے اس لئے اس ظاہری نقص کو دور کرنے کے لئے لوند کے مہینے کا اضافہ کیا گیا۔
تقریبًا ایک ہزار سال قبل مسیح ان نچھتروں میں سے بارہ چن لئے گئے اور سال کے بارہ مہینوں کو ان کے نام دئے گئے چنانچہ وقت شماری کے اس نادر طریقے کا ارتقا ہوا جس کے مہینوں کی بنیاد تو چاند کے گھٹاؤ بڑھاؤ پر ہے لیکن ہر چوتھے سال لوند کا ایک مہینہ بڑھا کر اس قمری سال کو شمسی سال کے برابر کر دیا جاتا ہے۔

علم ہیئت کے علاوہ مذہب ہی کی آڑ میں قدیم ہندوستانیوں نے صوتیات (سکشا) عروض (چھنداس) مادۂ الفاظ (شبد شاستر) اور صرف و نحو (ویاکرن) میں کمال پیدا کیا اور علم متعارفہ میں ایسی تحقیقات کی کہ ہندوستان کی نسبت سے ایک علم کا نام ہی علم ہندسہ پڑ گیا، چنانچہ عرب اس علم کے ماہروں کو مہندس کہنے لگے۔

مصنوعات میں بھی ہندوستانی کسی دوسری قوم سے پیچھے نہ تھے۔ مورخوں

اور محققوں نے اندازہ کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت سلیمانؑ کے زمانہ تک میں ہندوستانی اشیاء بابل، نینوا اور شام کے بازاروں میں ملتی تھیں اور توریت شریف کی کتاب پیدائش میں بعض ایسی اشیاء مثلاً مر اور گرم مسالے کا ذکر پڑھنے میں آتا ہے جو یہیں سے مغربی ایشیا کو گئی ہونگی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بابلی زبان میں ململ کا نام سندھو تھا اور کیا عجب کہ نمرود اور بخت نصر جو کپڑا پہنتے ہوں وہ ہندوستان ہی سے گیا ہو۔ اس کا ہمارے پاس کافی ثبوت ہے کہ ابتدا ہی سے ہندوستانی خود اپنے بنائے ہوئے جہازوں میں بیٹھ کر دور و دراز ممالک کا سفر کرتے اور مختلف اشیاء کی درآمد کرتے تھے۔ رگ وید میں ان سوداگروں کا ذکر ہے جو محض تجارت کے لئے اپنے جہازوں کو کھلے سمندر میں لے جاتے تھے اور جو غالباً خالدیہ بابل اور مصر کے ساتھ اس ملک کے تجارتی تعلقات قائم رکھے ہوئے تھے۔ راماین میں ایسے ہی بیانات پڑھنے میں آتے ہیں جن سے یہاں والوں جانبازیوں کا ثبوت ملتا ہے مثلاً سگریو حکم دیتا ہے کہ سیتا جی کو جزیروں میں تلاش کیا جائے اور باویرو جاتکا میں اس جانباز کا ذکر ہے جو سب سے پہلا مور بابل لے گیا ہوگا۔ اسی طرح مہابھارت سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچوں پانڈو ایسے جہاز میں بیٹھ کر چلدئے جن میں بڑی بڑی سمندری لہروں اور طوفانوں کا مقابلہ کرنے کی اہلیت تھی۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں برس پہلے کے ہندوستانی نہ تو سمندر سے خوف زدہ تھے نہ دوسرے ملکوں کو جانے سے جھجکتے تھے۔

ہندوستان کو تقریباً ہر شعبۂ زندگی میں جو ترقی ہوتی تھی اس کی تصدیق ہمیں دو کتابوں سے ہوتی ہے جن میں سے ایک تو خود ایک ہندوستانی کے

زور قلم کا نتیجہ ہے اور دوسری میں ایک یونانی سفیر نے اپنے احساسات کا نقشہ پیش کیا ہے۔ پہلی کتاب تو مہاراجہ چندر گپت موریا کے وزیر چانکیہ کی ارتھ شاستر ہے اور دوسری میگاس تھینس کی کتاب انڈکا ہے جس کے بعض چند اجزاء ہم تک پہنچے ہیں۔ یوں تو ان کتابوں سے اس زمانے کی زندگی کے ہر شعبہ پر روشنی پڑتی ہے، لیکن یہاں مختصراً یہ بیان کرنا کافی ہے کہ مگدھ کی راجدھانی پاٹلی پتر سے (جسے اب پٹنہ عظیم آباد کہتے ہیں) ایک شاہراہ شمال و مغرب کو جاتی ہے جس کے ہر موڑ پر مسافر کی راہ نمائی کے لئے ایک پتھر لگا ہوا تھا اور چندر گپت کے اس سے بھی زیادہ مشہور پوتے اشوک اعظم نے اس پر اور دوسری شاہراہوں پر جو سلطنت کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے ملاتی تھیں آدھ آدھ کوس کے فاصلے پر ایک ایک کنواں بنوایا اور مسافروں کے آرام کی خاطر درخت لگوائے شہروں کی تعمیر میں مستطیل اصول پیش نظر رکھا جاتا تھا اور ان میں نالیوں اور بدررو کا معقول انتظام تھا جن میں ہو کر شہر کا گندا پانی شہر پناہ کی خندق کی طرف نکل جاتا تھا بلدی سڑکوں کے کونوں پر آگ بجھانے کے لئے پانی سے بھرے ہوئے مٹکے رکھے رہتے تھے اور کپڑا بننے اور سونے چاندی کے کاموں میں لوگوں کو کمال حاصل تھا ہمیں میگاس تھنیس اور کوٹلیا سے بیرونی تجارت کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل ہوتے ہیں اور ہم پڑھتے ہیں کہ دوسرے ملکوں کے جواہرات اور موتیوں، مردہ جانوروں کی کھالوں، سوتی اور ریشمی کپڑے، سندھی گھوڑوں اور بہت سی دوسری مصنوعات کی ملک سے باہر بھی تجارت ہوتی تھی۔

ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں اس ملک کے باشندے

کسی دوسرے ملک سے پیچھے نہ تھے بلکہ بہت سے اموریں آگے بڑھے ہوئے تھے۔

زلزلۂ اناطولیہ

(۱۳ ؍ فروری ۱۹۴۰ء)

سلطنت ترکی کی انیسویں صدی کی تاریخ دراصل ترکوں پر دنیا تنگ ہونے کی تاریخ ہے۔ اس صدی میں ترکوں نے اپنی سلطنت کی بقا کے لئے جتنے جتن کئے ان میں سے ہر ایک کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترکی کے حدود تنگ سے تنگ تر ہو گئے۔ پہلے یونان نکلا، پھر رومانیہ و سربیہ اس کے بعد بلغاریہ اور مشرقی رومیلیہ اس کے بعد نووی بازار، البانیہ اور تھریس اور صلحنامہ سیورے نے تو ترکی کا کام تمام ہی کر دیا۔ اس صدی میں اس قوم نے دنیا میں اپنی بقا کے لئے کیا کیا نہیں کیا؛ لباس بدلا، یونانی ٹوپی کو ترکی بنایا، طرز حکومت بدلا، جنگوں میں غنیم کو، خواہ کوئی بھی ہو پے در پے شکستیں دیں، لیکن ہر نام نہاد اصلاح اور ہر فتح کے بعد ایک نہ ایک صوبہ نکل گیا۔ وہ تو "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند" کے مصداق "اتاترک" یا "ابولاتراک" نے انتہائی جد و جہد اور بے مثال قربانیاں کر کے ترکوں کے وطن یعنی اناطولیہ اور تھریس کو آزاد کرا دیا ورنہ ترکی آزادی کا اسی طرح خاتمہ ہو چلا تھا۔

جیسے حبش اور سیجوریہ کی آبادی کا۔ یہ جو علاقہ ترکوں کے پاس باقی رہا اس کا صرف ۵ فی صد حصہ یورپ میں ہے اور باقی اناطولیہ کے ولایات پر مشتمل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اناطولیہ میں جو تباہی اور بربادی حالیہ زلزلے کی صورت میں اور اس کے بعد کی آفتوں میں رونما ہوئی ہے اس سے دراصل ترکی کا ایک حصہ نہیں بلکہ تمام ترکی مملکت براہ راست متاثر ہے۔

۲۶ ہر ڈسمبر کو جب ہندوستان میں صبح کے چار بجے ہر شخص لحافوں اور کمبلوں میں لپٹا لپٹا یا آرام اور چین کی نیند سو رہا تھا اس وقت ترکی میں دو کا عمل تھا اور خدا کا غضب زلزلے کی شکل میں نمودار ہو رہا تھا۔ مکانات پتے کی طرح ہل رہے تھے، آناً فاناً گاؤں کے گاؤں اور شہر کے شہر ویران ہو رہے تھے، لوگ کڑاکڑے کے جاڑے میں، ایسا جاڑا کہ ہمارے وہم و گماں میں بھی نہیں آسکتا، اپنے گھروں کو، یا ان کے ڈھیروں کو چھوڑ جانے جان توڑ کوشش کر رہے تھے، لیکن کتنے تھے جو ان تودوں سے نکل سکے ہوں اور اکثر تو، عورتیں، مرد، بچے دیواروں اور چھتوں کے گرنے سے وہیں کے وہیں دب کر جان بحق ہوئے اس وقت بلا کی قیامت تھی، چیخوں اور آہوں سے، امیر غریب بوڑھے جوان سب کی چیخوں اور آہوں سے، ایک مکان یا قصبہ نہیں بلکہ ہزاروں مکان اور قصبے گونج رہے تھے۔ پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ اس زلزلے کی وجہ سے ریلوں کی پٹریاں اکھڑ گئیں یا مڑ گئیں سڑکیں خندقیں بن گئیں اور سوائے طیاروں کے کوئی سبیل کسی قسم کی امداد کی نہیں رہی۔ یہ تو وسطی اور مشرقی اناطولیہ میں ہوا؛ اس کے پیچھے ہی پیچھے شمالی اور مغربی اناطولیہ بھی محفوظ نہیں رہا۔ مغربی حصّے کے دریاؤں میں زد آنے کی وجہ سے

بیسیوں قصبے بہہ گئے اور بہت سے گاؤں جزیرے بن گئے اور شمال میں بحر اسود میں ایسا طوفان آیا کہ نہ معلوم کتنی کشتیاں اور چھوٹے جہاز تہ آب ہو گئے۔

یہاں بہتر ہے کہ جو مصائب ترکی پر چند روز میں آئے ان کا اسی ترتیب سے مختصراً بیان کیا جائے جس ترتیب سے ان کی خبریں ہم تک پہونچیں تاکہ ترکی کے روز افزوں مصائب کا اندازہ ہو سکے۔

۳۰ دسمبر۔ اناطولیہ کے زلزلے میں آٹھ ہزار شہید ہوئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ترکی کی تاریخ میں یہ آفت سب سے بڑی ہے اس لئے کہ ۱۹۲۸ء میں جو زلزلہ آیا تھا اس میں ہلاکوں کی تعداد صرف ۸۰۰ تھی اور وہ بھی کافی بڑی سمجھی گئی تھی۔ زلزلے کے ساتھ گیس کی سیکڑوں ٹنکیوں کے پھٹنے اور تیل کے لمپوں کے ٹوٹنے کی وجہ سے آگیں لگی ہوئی ہیں۔ ارزنجان اور اس کے قرب و جوار کے قصبات بالکل ڈھیر ہو گئے ہیں اور بحر اسود کے اضلاع سمسون اور اردو جو تنباکو کی کاشت کے مرکز تھے انھیں بھی شدید ترین نقصان پہونچا ہے۔

یکم جنوری۔ اب اندازہ ہے کہ زلزلے میں آٹھ ہزار نہیں بلکہ تیس ہزار ہلاک اور پندرہ ہزار زخمی ہوئے۔ زلزلے کا میدان ساٹھ ہزار مربع میل پر وسیع ہے اور یہ تمام رقبہ ایک عظیم الشان قبرستان یا زیر سما شفاخانہ بنا ہوا ہے۔ ریل کی پٹریاں مڑ گئی ہیں، پل ٹوٹ گئے ہیں، تار ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ پھر برف باری اور انجماد کی وجہ سے سڑکیں ناقابل عبور ہو گئی ہیں اور متاثرہ رقبے میں پہونچنا ناممکن ہے ریل کی جو پٹریاں سالم ہیں ان پر برف کے تودے پڑے ہوئے ہیں اور تاوقتیکہ بار بار یانی روک کر کدالوں بیلچوں سے برف کھود کر نہ ہٹایا جائے عبور ناممکن ہے

ارزنجان کی ہزاروں کی آبادی کا ۳۰ فیصد ہلاک اور ۲۰ فی صد مجروح ہو چکا ہے اور متاثرہ رقبے کے جو رہنے والے بچ گئے ہیں وہ بھی بے خانمائی اور سردی کی شدت کی وجہ سے نیم جان ہیں اور جلد جلد مر رہے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ صرف قصبہ توکت میں نوسو ہلاک اور ۴۰۰۰ زخمی ہو چکے ہیں۔

۲ جنوری۔ ترکی میں مصیبت پر مصیبت آ رہی ہے۔ ان رقبوں میں جو زلزلے سے متاثر نہ تھے طوفان آ رہے ہیں۔ ازمیر، بروصہ اور ادرنہ کے دریاؤں میں سخت ترین رو آ رہی ہے اور سیکڑوں کی تعداد میں انسان اور حیوان بہہ گئے ہیں۔

۳ جنوری۔ علاوہ مشرقی حصوں کے جنھیں زلزلے نے برباد کر دیا اور مغربی حصوں کے جنھیں دریاؤں کے طغیانی تاراج کر رہی ہے، بحر اسود میں نہایت شدید طوفان آ رہا ہے اور بہت سے چھوٹے چھوٹے جہاز اس کی نذر ہو رہے ہیں۔ مغربی اناطولیہ میں جھیل کراجا، میدان کمال پاشا اور منیسا جو سب کے سب ازمیر اور بحر مارمورہ کے درمیان واقع ہیں، برباد ہو گئے ہیں اور بہت سے مقامات پر پانی سطح زمین سے پانچ پانچ چھ چھ فٹ اونچا بہ رہا ہے۔ متلاطم دریاؤں کے سامنے جو آ رہا ہے، پل مکانات، گاؤں، سب ہی کو بہا کر لے جا رہے ہیں۔

ارزنجان ایک شہر خموشاں بنا ہوا ہے۔

۸ جنوری۔ سمسون کے رقبے میں مزید جھٹکے محسوس ہوئے۔ دریائے تیگے کی رو کی وجہ سے شہر وایر کر سخت خطرے میں ہے۔ مغرب میں طوفان باد و باراں کی وجہ سے ازمیر کا برقی سلسلہ ٹوٹ گیا ہے اور شہر مکمل تاریکی میں ہے۔

یہ ہے ان عظیم الشان مصائب کا سلسلہ بہ سلسلہ بیان جن سے ترکی کو
امن کے زمانے میں دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس بیان سے اس دور ابتلا کا جزو بھی
خیال میں نہیں آسکتا جس میں ہو کر مشرق کے اس مغربی علمبردار کو چند روز بلکہ
چند ساعتوں میں گذرنا پڑا۔ اول تو مشکل سے کوئی حصہ ایسا ہوگا جو براہ
راست متاثر نہ ہوا ہو، لیکن جن رقبوں پر سب سے زیادہ اثر پڑا ہے وہ ایسے
ہیں کہ تاریخی یا صنعتی اعتبار سے ان کی اہمیت میں کلام نہیں ہو سکتا۔ ادرنہ
یوروپی ترکی کا دوسرا شہر اور مرحوم سلطنت عثمانیہ کا مدت تک پائے تخت رہا ہے
ازمیر یا سمرنہ وہ مقام ہے جو جنگ عظیم کے بعد اتحادیوں نے یونانیوں کے
سپرد کر دیا تھا اور جہاں یونانیوں نے غریب ترکوں پر ہر طرح سے مظالم ڈھائے
اور جس پر از سر نو قبضہ کر کے غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے ترکی سلطنت کے درخشاں
مستقبل پر گویا مہر لگا دی۔ سمسون اور سیواس ترکی کی حالیہ تاریخ میں سب سے اہم مقامات
ہیں اور ان کی اہمیت حال کے ترکوں کی نظروں میں تقدس حد تک پہونچ جاتی
ہے اس لئے کہ سمسون بحیرہ اسود کی وہ بندرگاہ جہاں ۱۹ مئی ۱۹۱۹ء کو مصطفےٰ کمال
کا جہاز لنگر انداز ہوا اور جہاں سے اس قائد نے ترکی کی آزادی کے لئے جد و جہد
شروع کی۔ سیواس کا نام ترکی تاریخ میں رہتی دنیا تک قائم رہیگا اس لئے کہ
اسی مقام پر ۴ ستمبر ۱۹۱۹ء کو وہ کانگریس منعقد ہوئی جس میں آزادی کی شرائط طے
ہوئیں اور نئی ترکی کے زعمانے قرآن مجید پر اپنے ملک کو بیرونی اقتدار سے آزاد
کرانے کا حلف لیا۔ کمال پاشا اور نیف اس نواح میں ہیں جہاں ترکوں اور
یونانیوں کے درمیان پے در پے معرکے ہوئے اور یونانیوں کی شکستوں کے

باعث ترکوں کو آزادی نصیب ہوئی۔ یہ تو تاریخی اہمیت ہوئی۔ مالی اور صنعتی اعتبار سے بھی ترکی کو بیحد نقصان پہونچا اور زلزلے سے متاثرہ رقبے کی بربادی سے وہ حصہ جس میں ترکی تمبا کو پیدا ہوتا تھا (یعنی ارزنجان اور سیواس کا علاقہ) بالکل ویران ہوگیا۔ نئی ترکی کے جنم سے پہلے یہاں بڑی بڑی دلدلیں تھیں جنھیں خشک کرنے میں حکومت کو بے شمار روپیہ خرچ کرنا پڑا تھا اور اب یہ رقبہ اس قدر زرخیز ہوگیا تھا کہ علاوہ تمبا کو کے اس میں کپاس، جو، طرح طرح کے پھل اور دھان پیدا ہونے لگے تھے۔ اب یہ سب پیداوار محض قصۂ ماضیہ ہوکر رہ گئی ہے۔

ترکی حکومت نے فوراً باوجود اپنے وسائل کی کمی کے مصیبت زدہ اشخاص کی مدد نہایت مستعدی سے شروع کردی۔ صدر جمہوریہ عصمت انونو، وزیر داخلہ وزیر صحت بعض دوسرے اعلیٰ حکام کے معیت میں جلد از جلد متاثرہ رقبے میں پہونچ گئے اور اپنی ذاتی نگرانی میں رفاہ عام کا کام شروع کرادیا۔ زلزلے کے تین گھنٹہ کے اندر پہلی ہسپتال ٹرین متاثرہ رقبہ کی طرف روانہ ہوگئی اور طیاروں میں کوئلہ اور غذا کا سامان رکھ رکھ کر بھیجا جانے لگا تاکہ بیچارے بے خانماں عورتوں مرد، بچوں کو سردی اور بھوک سے بچنے کا کوئی طریقہ فراہم کیا جاسکے۔ پوری ترکی قوم امداد و اعانت کے لئے وقف ہوگئی، گھر گھر چندہ ہوا اور بعض خواتین نے اپنے زیور تک چندے میں دیدئے۔ ترک قوم بڑی غیور و دار شجاع ہے اور یہ ڈراما بھی شجاعت کے قصوں سے خالی نہیں۔ ایک تار بابو کا ذکر سننے میں آیا ہے کہ زلزلے کے وقت وہ اپنے فرائض ادا کررہا تھا۔ زلزلہ آرہا تھا اور وہ اس کی خبریں تار پر بھیج رہا تھا۔ فرض کے احساس نے اسے اپنی جگہ سے ٹلنے نہیں دیا حالانکہ موت

اس کی آنکھوں میں آنکھیں ملائے دیکھ رہی تھی اور تار گھرڈگر مگر ہو رہا تھا۔
ایک لمحہ آیا کہ دیوارگری اور یہ فرض شناس بابو انگلی تار کے کھٹکے پر ملک عدم کو
سدھارا۔ دوسرا قابل ذکر واقعہ ہے کہ زلزلے میں سرکاری جیل خانہ گرا تو جو قیدی
بچ گئے تھے وہ بھاگے نہیں بلکہ اپنے نگہبانوں کے ساتھ رفاہی کاموں میں مشغول
ہوگئے اور زخمیوں کو جیل خانے کی کوٹھریوں میں لاکر رکھا۔ جب یہ سب کچھ ہوگیا
توان قیدیوں نے اپنے آپ کو سرکاری عہدہ داروں کے حوالہ کرایا کہ ابھی ہماری
قید کی مدت باقی ہے جہاں آپ بھیجیں ہم جانے کے لئے تیار ہیں۔ حکومت نے
ان سب قیدیوں کو رہا کر دیا۔

خدا کے فضل سے ترکوں نے اپنی سیاسی حیثیت کو اتنا بڑھا لیا ہے اور
اس دنیا میں اس کی اتنی اہمیت ہو گئی ہے کہ اس کے نقصان کو دول عالم اپنا
نقصان سمجھنے لگتے ہیں چنانچہ اکثر بڑے بڑے ملکوں نے اس ابتلا سے نکلنے
کے لئے ترکوں کو معتد بہ رقم دی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آج کل انگلستان اور
فرانس اس اسلامی اور ایشیائی ملک کے دوست ہیں اور ان دونوں ملکوں نے
اس دوستی کا حق ادا کر دیا ہے چنانچہ انگلستان نے ۲۵ ہزار پونڈ یعنی تقریباً ساڑھے
تین لاکھ روپیہ اور ایک ہسپتالی جہاز اور فرانس نے پونے تین لاکھ روپیہ امداد میں
دیا۔ اس کے علاوہ روس سے دس ہزار ڈالر، افغانستان سے دو ہزار پونڈ اور
آسٹریلیا سے دس ہزار پونڈ وصول ہو چکے ہیں۔ یہ تو صرف چند ہی ملکوں کی امداد ہے
حقیقت یہ ہے کہ کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس کا دل اس تو خیز جمہوریہ کی تکلیف سے
بھر نہ آیا ہو۔

ہندوستان میں ہندو مسلمان عیسائی سب ہی چندوں میں شریک ہو رہے ہیں۔ خود ہمارے حیدر آباد میں اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خسرو دکن خلد اللہ ملکہٗ نے اپنی ذات اقدس سے تیرہ لاکھ فرانک یعنی ایک لاکھ سے زیادہ روپیہ کی گراں قدر رقم مصیبت زدوں کی امداد میں عطا فرمائی ہے اور جو فہرست عالی جناب نواب سالار جنگ بہادر کی صدارت میں کھولی گئی ہے اس میں چندے کی بہت کچھ رقم جمع ہو گئی ہے امید ہے کہ ہم اپنی پرانی روایات کو قائم رکھ کر ترکوں کے دکھ میں جہاں تک ہم سے ممکن ہو گا اپنی شایان شان امداد سے کوتاہی نہیں کریں گے۔

عید میلاد

(۲۰ اپریل ۱۹۴۰ء)

دنیا کے بڑے بڑے فلسفیوں، رشیوں، نبیوں اور مصلحوں کے جنم اتساو منائے جاتے ہیں۔ سری رام چندر جی کی رام نومی، سری کرشن جی کی جنم اشٹمی، مہاتما گوتم بدھ کی برسی، حضرت عیسیٰؑ کا یوم مولود یعنی بڑا دن، سب ہی منائے جاتے ہیں، اور مشکل سے کوئی مہینہ ایسا ہوگا جس میں کسی نہ کسی مقدس شخص کا عرس یا جاترا نہ ہوتی ہو۔ ان جنم دنوں میں سے کسی میں خوشیاں کی جاتی ہیں، کسی میں گانا بجانا ہوتا ہے۔ کسی میں کسی خاص مقصد کے تحت جلسے ہوتے ہیں اور تقریریں کی جاتی ہیں، کسی میں پوجا پاٹ یا ممدوح کی زندگی کے کارنامے بتائے جاتے ہیں تاکہ یہ ہماری نسل کے لئے سبق آموز ہوں۔ اصل میں تو بڑے بڑے شخصوں کی پیدائش یا وفات کی یاد قائم کرنے کا کوئی افادی پہلو ہے تو بس یہی کہ ممدوح کی زندگی کے حالات بیان کئے جائیں اور دکھایا جائے کہ اس دنیا کی تاریخ میں اس کی کیا اہمیت ہے کس طرح اس نے اپنے ہم جنسوں میں اپنے آپ کو برگزیدہ کرکے بنی نوع انسان کو

سبق سکھایا اور باوجود طرح طرح کی مشکلات اور دشواریوں کے وہ اپنے اصول
سے نہیں ہٹا۔ باقی گانا بجانا، روشنی اور جلوس، یہ تو بعد کی باتیں اور محض زوائد
ہیں اور بعض کے نزدیک اصل مقصد سے ہٹ کر لوگوں کے لئے محض دل فریبی
پیدا کرنے کے طریقے۔

حضرت محمد صلعم کی یوم ولادت اور شاید یوم وفات دونوں آج
(۱۲ ربیع الاول) ہی کی تاریخ میں پڑے ہیں۔ یہ کہنا بے سود ہے کہ آنحضرتؐ کو
دنیا کے چالیس کروڑ مسلمان دنیا کا سب سے بڑا انسان، سب سے بڑا مصلح،
سب سے بڑا پیغمبر، تصور کرتے ہیں۔ لیکن محض مذہبی حیثیت سے گریز کرنے پر
بھی آنحضرت کی شخصیت ایسی ہے کہ صحیح فکر والا غیر مسلم بھی ان کی برگزیدہ شخصیت کو
تسلیم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے جو کیا وہ
یہ نہیں کہ کسی نئے عقیدے کی ایجاد کرتے یا نعوذ باللہ اپنے آپ کو خدا کے برابر کرنے کی
کوشش کرتے۔ ان کی خالص مذہبی تعلیم تو بس یہ تھی

نصاریٰ کی مانند دھوکا نہ کھانا — کسی کو خدا کا بیٹا بنانا
میری حد سے رتبہ نہ میرا بڑھانا — بڑھا کر بہت تم نہ مجھ کو گھٹانا

سب انساں ہیں واں جس طرح سرفگندہ
اسی طرح ہوں میں بھی اک اس کا بندہ

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم — نہ کرنا میری قبر پر سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم — کہ بیچارگی میں برابر ہیں ہم تم

مجھے حق نے دی ہے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی

غرض عقیدے کی حد تک آنحضرت صلعم نے بس اتنا سکھایا کہ خدا ایک ہے اور میں اس کا بھیجا ہوا ایلچی ہوں جو اس کا پیام لوگوں کو پہنچاتا ہو۔ یہ ایک عجیب و غریب آواز تھی جس کے سننے والے جاہلوں کو پہلے ہنسی آئی پھر غصہ آیا پھر وہ سوچنے لگے، اور آخر ایک اعتبار سے تمام باشندگان عالم نے لبیک کہا، اس لئے کہ یہ کسی سربستہ راز کا انکشاف نہیں بلکہ مسلّمہ واقعہ ہے کہ دنیا کا کوئی ملک، کوئی قوم، کوئی مفکر، مشکل سے ایسا ہوگا جس پر اسلامی توحید کا اثر نہ پڑا ہو اور جو حضرت محمد صلعم کو خدا کا رسول نہیں تو کم از کم دنیا کا ایک عظیم الشان محسن نہ سمجھتا ہو۔

اس ایک عقیدے کے علاوہ آنحضرت صلعم کی تعلیم کا لب لباب صرف عرب میں نہیں بلکہ تمام بنی آدم کی ہر جہتی اصلاح، ہر جہتی ترقی، ہر جہتی فلاح و بہبود کا سامان فراہم کرتا ہے۔ آنحضرت صلعم کے اس دنیا میں تشریف لانے کے وقت دنیا کا اخلاقی نظام بالکل درہم برہم ہو چکا تھا۔ اخلاق کی بنیاد مذہب پر ہوتی ہے۔ یونان و روما کے عہد میں مشکل سے کوئی ایسا گناہ ہوگا جس کے مرتکب یونان اور روما کے دیوتا اور دیویاں نہ ہوتے ہوں۔ جھوٹ بولنا، دھوکا دینا، شراب پینا، جنسی بدکاری، یہ سب باتیں گویا دیوتاؤں اور دیویوں کی سنت تھیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم سے یہ سب بری حرکات مٹ جانی چاہیئے تھیں لیکن جو لوگ اپنے آپ کو اس سراپا رحم پیغمبر کی تعلیم سے منسوب کرتے تھے وہ اس تعلیم سے بہت جلد ہٹ گئے، یہاں تک کہ اس نبی کی امت ہونے کے باوجود جس کے مذہب میں تشدد یا انتقام کا شائبہ بھی نہ تھا

وہ علی الاعلان اپنے اغراض کے تحت قتل و غارت اور خونریزی کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کرتے تھے۔

یہاں اس زمانے میں یورپ کی سب سے متمدن سلطنت یعنی سلطنت روم کی کیفیت سے معلوم ہوگا کہ عرب ہی نہیں بلکہ عرب سے باہر بھی دنیا کی اخلاقی حالت میں کس درجہ پستی اور عدم رواداری تھی اور دنیا کسی ایسے محسن انسان کی آمد کی منتظر تھی جو اسے اس پستی سے نکالے۔ روم میں حکومت شہنشاہ کا ایک خانگی معاملہ سمجھی جاتی تھی۔ جسٹی نین نے قدیم سیاسی نظام کا نام نشان مٹا دیا اور حکومت کی تنظیم اسی نہج سے کی کہ ہر چیز کو دربار کی زینت کے اغراض سے جرمانہ اور تاوان کے بہانے ضبط کیا جاتا تھا۔ غلام تو غلام آزاد شہریوں کو پکڑ پکڑ کر فروخت کیا جاتا تھا۔ لوگ محصولوں سے بچنے کیلئے اپنے کھیتوں اور باغوں کو اجاڑ دینا پسند کرتے تھے۔ مذہبی معاملات میں مطلق کوئی رواداری نہ تھی۔ جب تک مسیحیت قبول نہ کی گئی تھی اس وقت تک مسیحیوں پر طرح طرح کے مظالم کئے جاتے تھے، جب بادشاہ عیسائی ہوگیا تو ہر اس چیز کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے میں کوئی کسر اٹھا کر نہ رکھی گئی جس میں شاہی مذہب سے انحراف کا ادنیٰ شائبہ بھی ہو۔ آنحضرت صلعم کی ولادت سے ۴۰ سال پہلے جسٹی نین نے بلاغت اور فلسفے کے مدارس، افلاطون کی اکاڈمی، ارسطو کے خطابت خانے، زینو کی درس گاہ کے دروازے، ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے اور متعلق تمام اوقاف ضبط کرلئے۔ سلطنت کی اخلاقی حالت کی ابتری کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ قیصر ہرقل نے خود اپنی بھتیجی سے شادی کی اور باضابطہ نکاح پڑھوایا لیکن کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ اسے اس حرکت سے روک سکے۔

الغرض دنیا میں بہیمیت اور درندگی کا دور دورہ تھا، اور عرب تو صدیوں سے ایسا مدہوش تھا کہ اسے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ تہذیب و تمدن کے گہوارے کہاں ہیں۔

زمیں سنگلاخ اور ہوا آتش فشاں — لوؤں کی لپٹ باد صرصر کے طوفاں
پہاڑ اور ٹیلے سراب اور بیاباں — کھجوروں کے جھنڈ اور خار مغیلاں
نہ کھتوں میں غلہ نہ جنگل میں کھیتی
عرب اور کل کائنات اس کی یہ تھی

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ — ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ — نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر — تو خوف شماتت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور — کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جاکر
وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

جوا ان کی دن رات کی دل لگی تھی — شراب ان کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
تعیش تھا غفلت تھی دیوانگی تھی — غرض ہر طرح ان کی حالت بری تھی
بہت اس طرح ان کی گذری تھیں صدیاں
کہ چھائی ہوئی نیکیوں پر تھیں بدیاں

غرض دنیا کی اخلاقی سیاسی، مذہبی، معاشرتی، ہر حیثیت زندگی انتہائی نکبت اور پستی کی حالت میں تھی کہ آنحضرت رسول خداؐ اس دنیا میں تشریف لائے اور لڑکپن ہی سے اس پستی کے علاج کے سوچ میں پڑ گئے۔ وہ اکثر مکہ سے باہر ایسی پہاڑیوں کے غاروں میں جو تمازت آفتاب کی وجہ سے کالی پڑ گئی تھیں اور جن پر گھاس تک پیدا نہیں ہوتی تھی، تنہا جا کر گھنٹوں گیان دھیان میں مصروف رہتے۔ آخر جب عمر ۴۰ سال کی ہوئی تو ایسے ہی ایک غار میں انھیں روشنی نمودار ہوئی اور صرف عرب ہی کی نہیں بلکہ تمام عالم کی گویا کایا پلٹ گئی، یعنی غار حرا میں وہ عجیب و غریب دریا در کوزہ آیت نازل ہوئی جس میں ایک ان پڑھ انسان سے جو حرف شناس بھی نہ تھا کہا گیا کہ "پڑھ" اور جس میں ایک طرف انسان کی حقیر اصل اور دوسری جانب انسانی بزرگی کے سرچشمے یعنی علم کی اہمیت واضح کی گئی، اور ساتھ ہی یہ بتایا گیا تھا کہ خداوند کریم نے انسان کو علم ہی کے ذریعے سے برتری دی ہے۔

آنحضرت صلعم نے بنی آدم کی اصلاح کی تبلیغ برابر ۲۳ سال کی، اور باوجودیکہ "لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ" کے اصول کے بموجب کسی کو مجبور نہیں کیا گیا لیکن آنحضرتؐ کی زندگی کے آخری سال تک تمام عرب انھیں اپنا ہادی اور رہنما سمجھنے لگا تھا، اور جب ہجرت کے دسویں سال آنحضرتؐ مدینہ سے مکہ کو اپنی عمر کا آخری حج کرنے تشریف لے گئے تو ان کا پیام سننے کے لئے ایک لاکھ ۲۴ ہزار نفوس کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا انسانی سمندر میدان عرفات میں جمع تھا۔ یہ میدان اسی مکہ کے قریب کا میدان تھا جس کے باشندے اسی ہادی کا پیغام سن کر پہلے ہنستے تھے، اور پھر غصے میں آئے تھے اور

پیغام بر کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ اب اس حجۃ الوداع کو، ۲ مارچ ۶۳۲ء کے معرکۃ الآرا دن، ان میں سے ہر ایک ننگے سر، ایک کپڑا باندھے ایک اوڑھے، اسی شخص کا آخری پیغام سننے کو آیا ہے۔ سرکار دو عالم اونٹنی پر سوار ہیں۔ آپ جو فرما رہے ہیں سب بآواز بلند دہراتے ہیں " اے لوگو توجہ سے سنو اور یاد رکھو، ممکن ہے کہ آیندہ مجھے تم سے ملنے کا موقع نہ ملے۔ جس طرح تم اس دن اس مہینے اور اس مقام کی حرمت کرتے ہو اسی طرح تمھارے خون اور تمھارے مال اور تمھاری آبروئیں ایک دوسرے پر حرام ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمھارے ہر ایک کام کا حساب لے گا۔ دیکھو میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ پھر ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ جس طرح تمھارے حقوق اپنی بیبیوں پر ہیں اسی طرح تم پر تمھاری بیبیوں کے حقوق ہیں ان کے ساتھ نرمی اور مہربانی سے پیش آنا اور ان کے حقوق کا لحاظ رکھنا۔ غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک رکھنا، جو کھاؤ انھیں کھلانا اور جو پہنو انھیں پہنانا۔ ان سے خطا ہو تو درگذر کرنا یا انھیں علیٰحدہ کر دینا۔ وہ بھی اللہ کے بندے ہیں۔ نہ عرب کو عجمی پر، نہ عجمی کو عرب پر کوئی فضیلت ہے۔ تمھارے کسی بھائی کی کوئی چیز تم پر حلال نہیں جب تک وہ اسے رضا مندی سے بخشش نہ دے...... تم کو لازم ہے کہ میرا یہ کلام ان لوگوں کو پہنچا دو جو یہاں موجود نہیں ہیں...... "

خطبہ ختم کرنے کے بعد آنحضرتؐ نے بلند آواز سے فرمایا کہ کیا میں نے پیغام پہونچا دیا اور ہزار ہا انسانوں نے جواب میں عرض کیا کہ ہاں آپ نے پہونچا دیا۔ اس سوال جواب سے اس ریگستانی وادی میں ایک ایسی گونج پیدا ہو گئی جو دنیا کے ہر گوشے میں پھیل گئی۔

اگر دنیا میں کسی شخص کے بڑے ہونے کی یہ دلیل ہے کہ اس کے پاس بیٹھنے اٹھنے والے بات چیت کرنے معاملات سدھارنے اپنے اہل وعیال سے برتاؤ کرنے سونے جاگنے کے طریقوں کو ایسا اہم تصور کریں کہ تقریباً ہر بات کو تحریر میں لانا اپنا فرض سمجھیں تو بلاشبہ دنیا کی سب سے بڑی ہستی کہ حضرت محمد صلعم کی تھی۔ دنیا میں دھیانی گیانی، بادشاہ، وزیر، مصلح، فلسفی بے شمار گذرے ہیں لیکن بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جس قدر عظیم الشان مواد آنحضرت صلعم کی سیرت مبارک کا ہمارے پاس محفوظ ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی دوسرے شخص کے متعلق نہیں۔ آنحضرتؐ کی زندگی کا کوئی پیرایہ ایسا نہیں جس کی بابت مکمل معلومات نہ ہوں۔ شکل، صورت، لباس، اخلاق واطوار، دنیوی برتاؤ، عبادات، دوسروں سے سلوک، فقر و غنا، غرض ہر چیز کی من وعن دم واپسین تک کی تفصیلات ان کے صحابۂ کرام نے جمع کر دی ہیں، اور یہ سب محض روایات اور من گھڑت قصے نہیں بلکہ تاریخی سند کے درجوں کو پہونچ گئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود اپنے ہم عصروں کی نظروں میں وہ کس قدر برگزیدہ اور ممتاز تھے۔

آنحضرت صلعم کی عظمت کا لوہا صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی مانتے ہیں۔ ختم کرنے سے پہلے ایک ہندو بھائی کی لکھی ہوئی نظم گوش گذار کرنا چاہتا ہوں۔ یہ نظم انوکھی نہیں بلکہ ان بے شمار مدح سرائیوں میں سے ایک ہے جو ہر ملک کے سوچنے والے انسانوں نے آنحضرتؐ کی ہیں۔ جناب پنڈت ہری چند صاحب اختر ایم اے فرماتے ہیں:-

نظم

کس نے ذروں کو اٹھایا اور صحرا کردیا
کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کردیا
زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پہ
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کردیا
شوکت مغرور کا کس شخص نے توڑا طلسم
منہدم کس نے الہٰی قصر کسریٰ کردیا
کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا دُرِ یتیم
اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولیٰ کردیا
کہدیا لا تقنطوا اخترؔ کسی نے کان میں
اور دل کو سربسر محو تمنا کردیا
سات پردوں میں چھپا بیٹھا تھا حسن کائنات
اب کسی نے اس کو عالم آشکارا کردیا
آدمیت کا غرض ساماں مہیا کردیا
اک عرب نے آدمی کا بول بالا کردیا

آج کل کے اندوہگیں زمانے میں جب انسان خونخوار درندوں کی طرح دوسروں کے ملکوں پر حملہ کرنے، امن و امان سے رہنے والے مردوں، عورتوں، بچوں کی زندگی کو خطرے میں ڈالنے اور انھیں بے دردی سے ختم کرنے، حکمیات اور فطرت کے مادی مضمرات سے اپنے ہم جنسوں کو ہلاک کرنے میں لگا ہوا ہے، جب خود ہمارے ملک ہندوستان میں بے اعتمادی کی آگ لگی ہوئی ہے، بین اقوامی سیاسیات کے موضوع پر تقریر کرنا بظاہر صدا بصحرا سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لیکن آج کل کی درندگی کے زمانے میں ہی اس کی ضرورت ہے کہ کبھی کبھی ہم شیخ شیراز رحمۃ اللہ علیہ کے اس عالی مطمح شعر کو سامنے رکھ لیا کریں جہاں انھوں نے کہا ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند کہ در آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار دگر عضوہا را نماند قرار

یعنی اس تخیل کو بھی کبھی کبھی اپنے دل میں جگہ دے لیا کریں جس کے تحت ہمارا اعلیٰ ترین مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے مفاد کے ساتھ بنی نوع انسان کی فلاح

بہبود کو بھی مدنظر رکھیں جس طرح ہم ایسے شخص کو جو صرف اپنے عیش و عشرت میں لگا ہوا ہو اور دوسروں کے دکھ درد کی پرواہ نہ کرے ہو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گے اسی طرح ہمیں ان قوموں کو بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے جو محض اپنے ہی لئے جیتی ہیں اور اپنے ہی مادی مفاد کو اپنا مقصد حیات بنائے ہوئے ہیں اور اس کے حصول کے لئے وہ اور دوسروں کو دھوکا دے کر یا ان پر جبر کر کے انھیں مغلوب کرنے کے درپے ہیں

یہ ایک ناقابل انکار واقعہ ہے کہ حکمیات یعنی سائنس دانوں نے مادی حقائق فطری کا تجسس کر کے بین اقوامی یا خالص انسانی تخیل میں بجائے اضافہ کرنے کے اسے ایک زبردست دھکا لگایا ہے۔ اب جبکہ فاصلے اور وقت کا سوال پہلے کی طرح اہم نہیں رہا اور ہم چشم زدن میں ہزاروں میل کی بات چیت خود اپنے کانوں سے سن سکتے اور سینکڑوں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دنیا کے چاروں طرف چند دن میں سفر کر سکتے ہیں، ہونا یہ چاہیئے تھا کہ ہر شخص کے دل میں بین اقوامی احساس پیدا ہو جائے اور کالے گورے، مشرقی، مغربی، ایشیائی یوروپی کا فرق صلح و آشتی میں کسی قسم کا نقص پیدا نہ کرے۔ لیکن اس کے برعکس حکمیاتی انکشافات کا نتیجہ بظاہر اس سے زیادہ نہیں نکلا کہ انسان نے اپنی انتہائی ترقی کا ماحصل یہ قرار دے دیا ہے کہ دوسروں کو جانے دیجئے، اپنے ہی رنگ روپ، اپنے ہی مذہب، اپنے ہی تمدن والوں کو بیگانہ بنا دے اور اپنی جوع ارضی کی خاطر تمام اعلیٰ تصورات کو روند ڈالے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بین اقوامی تخیل ایک اعلیٰ روحانی تخیل ہے اور اس میں اور محض مادی حکمیاتی انکشافات سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

ایک شخص یا ایک قوم کی حرص و آز کی وجہ سے دنیا میں کشت و خون کا جو

بازار گرم ہے اس کے باوجود آج بھی بہت سے ایسے ہیں جو اسی جنگ کے بعد کی
حالت کو بہتر بنانے کی فکر میں ہیں۔ ابھی چار پانچ مہینے کا عرصہ ہوا کہ ایک
لندنی مہربان جے ایچ ہمفریز صاحب نے، جو انجمن نیابت تناسبہ یعنی

Proportional Representation Society

کے معتمد ہیں اس بارے میں ایک گشتی مراسلہ مختلف ممالک کے مفکروں کے
پاس جاری کیا تھا اور ساتھ ہی میری بھی ناچیز رائے دریافت کی تھی کہ جنگ
کے بعد دنیا کا سیاسی ڈھانچا کس طرح کا بنایا جائے کہ بنی نوع انسان کے درمیان
جو تناقص ہے وہ مٹ جائے۔ یوں تو ہر جنگ کے بعد اس میں جو قتل و غارت
ہوتا ہے اس کے خلاف ایک عظیم ردِ عمل پیدا ہوتا ہے۔ جنگ میں ایک دو نہیں
ہزاروں بے قصور عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں، لاکھوں غریب بچے یتیم ہو جاتے
ہیں، کروڑوں اپنے اپنے گھر برباد ہوتے اور جو کچھ اپنا سمجھتے تھے اس کا خرابہ ہوتا ہوا
دیکھتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ محض وہ لے کر جو اپنے کندھوں پر اٹھا سکیں اپنا
گھر بار اور سب کچھ چھوڑ کر کسی دوسرے شہر دوسرے ملک اور دوسرے خطے کو
ہجرت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر جنگ کے بعد اسی بھیانک صورتِ حال
کے خلاف صرف ردِ عمل ہوتا ہے جس کا فوری نتیجہ لڑنے والے فریقوں کے درمیان
مصالحت کی شکل میں رونما ہوتا ہے، اور اگر جنگ عالمگیر ہے تو ایک عام خواہش
ہوتی ہے کہ کسی طرح سے آئندہ جنگ کے تخیل ہی کا خاتمہ کر دیا جائے اور امن و
امان، صلح و آشتی کی سبیل نکالی جائے۔ اس سے بھی مبارک ان لوگوں کے نتائجِ فکر
ہیں جو بغیر ایسے ردِ عمل ہی اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ انسان میں کس طرح انسانیت

قائم ہو سکے اور وہ اپنے بھائی کا خون پینے سے کیسے باز رہ سکے۔

دنیا میں یہ جذبہ کہ بنی آدم ہی خواہ کہیں رہتے ہوں، کس نسل سے پیدا ہوں، کسی رنگ روپ کے ہوں، یگانگت ہونی چاہیئے برابر کارفرما رہا تاکہ ایسے قواعد بن سکیں جن کے ذریعے سے انسان میں اپنے بھائی کے خلاف بہیمیت کے جذبے میں کچھ کمی ہو جائے یہی وہ قواعد ہیں۔ جنھیں مجموعی طور پر بین اقوامی قانون کا لقب دیا جاتا ہے۔

نظری اعتبار سے سب سے پہلا شخص جسے بین اقوامی سیاسیات اور بین اقوامی قانون کو ایک جداگانہ فن کا رتبہ دیا وہ ولندستان کا باشندہ گروتیوس تھا جسے ۱۶۲۵ء میں اپنی کتاب "قانون جنگ و امن" لکھ کر ایک نیا اور وسیع میدان قائم کیا۔ گروتیوس کا زمانہ یورپ میں مذہبی جنگوں کا زمانہ ہے جب ہندوستان میں اکبر اعظم فتح پور سیکری کے دیوان خاص کی اونچی نشست پر بیٹھ کر جو ہندوستان کی بین اقوامی صلح و آشتی کے زمانے پر آٹھ آٹھ آنسو بہانے کے لئے آج تک باقی ہے تمام مذاہب کے سرگروہوں سے اپنے اپنے مذہب کے عقائد کے موافق دلائل و براہین ٹھنڈے دل سے سنتا اس زمانے میں یورپ والوں کے تین عظیم الشان کیمپوں میں منقسم تھا اور بیسیوں سال سے مذہب کے نام پر بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا تھا۔ گروتیوس پر جنگ اور خوں ریزیوں کا بڑا اثر پڑا اور اس نے محسوس کیا کہ گو جنگ کا خاتمہ تو نہیں ہو سکتا لیکن اس کی شدت کو کم زور کیا جا سکتا ہے اور بین اقوامی قانون کے نظریہ کی بنیاد رکھی۔

مفکرین کے خیالات کو نظر انداز کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ لڑنے والوں کے درمیان آپس کا کسی نہ کسی طرح کا سلوک ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ قدیم یونان بیسیوں چھوٹی چھوٹی مملکتوں میں منقسم تھا اور ایک مملکت کا دوسری مملکت سے جو سلوک تھا وہ فی الجملہ اچھا تھا چنانچہ جنگ کی نوبت آتی تو پہلے باضابطہ اعلان جنگ کیا جاتا اور بعض اشخاص و ادارات مثلاً بت خانے اور ندما محفوظ سمجھے جاتے تھے۔ یونان کے بعد روما کا زمانہ آتا ہے اور گو روما کی سلطنت حدود ایران اسکاٹستان تک پھیلی آئی تھی جس کی وجہ سے مشکل سے قرب و جوار کا کوئی ملک ایسا ہوگا جس پر اس سلطنت کا پرچم نہ بلند ہوتا ہو تاہم یہاں بھی جنگ و امن کے لئے خاص خاص ضابطے مقرر تھے۔ رومن قوانین کے بڑے دلدادہ تھے چنانچہ انھوں نے جنگ جیسے خون خوار ادارے کو بھی قانونی جامہ پہنا دیا اور یہ اصول قرارداد یا کہ جنگ ایسی حالت میں قانوناً جائز سمجھی جائے گی کہ کوئی قوم رومن سرحدوں یا سفیروں پر حملہ کرے یا عہدناموں کو توڑے یا رومنوں کے دشمنوں سے جا ملے۔ اگر رومنوں کو ہتھیار اٹھانا پڑے تو جنگ تین میں سے ایک طرح سے ختم کی جاسکتی تھی؛ یا تو رومن اس ملک پر قبضہ کرلیں ورنہ فریق ثانی ہتھیار ڈالدے یا وہ رومنوں کا حلیف بن جائے۔

رومن قانون کے بعد سند واری اعتبار سے قانون اسلام کے زمانہ کا ہے اور جیسے اسلام نے ہر دوسرے انسانی ادارے میں عظیم الشان انقلاب برپا کیا اسی طرح بین اقوامی طرز عمل میں بھی بدیہی تبدیلیاں ہیں۔ جس زمانے میں اسلامی اصول دنیا کے سامنے پیش کئے گئے ہیں وہ ایسا زمانہ تھا کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام

عالم جنگ آزما قوموں، فرقوں، گروہوں اور طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ اسی حالت میں
پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو جنگ کی صرف ایسی حالت میں
اجازت دی گئی ہے کہ دشمن ان پر زیادتی کریں اور جنگ صرف ان لوگوں کے
خلاف برپا کی جائے جنھوں نے مسلمانوں پر مظالم ڈھائے ہوں اور فتنے کے ختم ہوتے
ہی تلوار نیام میں ڈال دی جائے۔ جو غیر مسلم مسلمانوں کے حلیف ہوں ان کے خلاف
کسی کی صورت میں عہد شکنی کی ابتدا نہ کی جائے اور انھیں اپنا دوست سمجھا جائے
اسلام نے جو اصلاح جنگی قیدیوں کی حالت میں کی وہ بنی آدم پر اس کا بڑا بھاری احسان
ہے۔ جنگ بدر پہلی جنگ ہے جس میں اس قاعدے کی ابتدا کی گئی کہ قیدیوں کو
آرام و آسائش سے رکھا جائے اور ایک قلیل فدیہ یا چھوٹی سی خدمت کے معاوضے
میں انھیں چھوڑ دیا جائے۔ انسانیت کا یہ سبق تھا جس کی وجہ سے وہی عرب
جن کے مرد تو مرد عورتیں تک غنیموں کی لاشوں پر ترس نہ کھاتی تھیں اور مقتولوں
کے ناک کان کاٹنے اور ان کا کلیجہ تک چبا جانے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتی تھیں ایسے
شریف بنا دیے گئے کہ جب پیغمبر اسلام اپنے وطن میں دس ہزار جاں نثاروں کے ساتھ
مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو انھوں نے اپنے مقدس پیشوا کے احکام کی اطاعت میں
ان ظالموں میں سے کسی کو ہاتھ تک نہیں لگایا جنھوں نے آٹھ سال پہلے انھیں انتہائی
ظلم و ستم ڈھا کر انھیں اپنے جنم بھومی سے نکال دیا تھا۔

جہاں تک یورپ کا تعلق ہے وہاں نظامِ جاگیرداری جزوی تبدیلیوں
کے ساتھ پندرھویں صدی عیسوی تک قائم رہا لیکن اس صدی کے وسط میں ایسی
مملکتیں جیسے فرانس، انگلستان اور اسپین کے استحکام کی وجہ سے عالمگیر سلطنت کے

تخیل کو بڑا دھکا لگا۔ نپولین نے تقریباً تمام یورپ کو فتح کرلیا تھا اور اس کے زوال کے بعد جنگ کے خلاف ایک ردِ عمل شروع ہوا چنانچہ زار روس نے اسی طرح محالفۂ مقدس کی بنیاد ڈالی جیسی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۱۹ء میں انجمن اقوام کی بنیاد امریکہ کے صدر وڈرو ولسن نے ڈالی تھی۔ انیسویں صدی کے خاتمے سے ۱۹۱۴ء کے زمانے بین اقوامی تخیل میں ترقی کا زمانہ تھا۔ زار روس کے طلب نامے پر ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء میں ولندستان کے پایۂ تخت ہیگ میں دو بین اقوامی کانفرنسیں جمع ہوئیں جنھوں نے ایک مستقل بین اقوامی عدالت قائم کی۔ جنگ روس وجاپان کے بعد ۱۹۰۷ء میں اسی مقام پر ایک تیسری کانفرنس مجتمع ہوئی جس میں قانون جنگ پر مفصل بحث ہوئی اور انگلستان کی دعوت پر ۱۹۰۹ء میں ایک بین اقوامی کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی جس نے بحری جنگ کے متعلق قواعد بنائے اسی دوران میں بہت سے بین اقوامی سیاسی ادارے قائم ہوئے جیسے سنساری اتحاد تار برقی، ادبیات وفنون لطیفہ کے شاہکاروں کی حفاظت کا ادارہ سکّے اوزان، پیمانوں وغیرہ کی یکسانی کے محالفے اور اتحاد صلیب احمر اور ہلال احمر کی بین اقوامی انجمنیں جس کا مقصد جنگی زخمیوں کی نگہداشت اور مرہم پٹی کرنا تھا۔

جنگ عظیم کے دوران میں جو اگست ۱۹۱۴ء سے نومبر ۱۹۱۸ء تک جاری رہی، بین اقوامی ہیئتوں کو بڑا دھکا لگا اور یہ سب ادارے تقریباً کالعدم ہوگئے۔ وڈرو ولسن کے مشہور ۱۴ نقاط جو مغلوب اور پست جرمنی کے سامنے پیش کئے گئے تھے، سب کو معلوم ہیں۔ ان میں اسنے اپنی دانست میں سب سے اہم نقطہ ایک ایسی انجمن اقوام کے قیام کی تحریک پر مشتمل تھا جس کے ذریعے سے اس کے زعم میں

تمام مملکتوں کی سیاسی آزادی اور علاقہ جاتی تفرد کی ضمانت ممکن تھی۔

کسی زمانے میں اس انجمن کا بڑا زور شور تھا۔ گو امریکہ والوں نے اپنے صدر کا ساتھ نہیں دیا اور اس انجمن سے الگ رہتے لیکن ممالک متحدہ امریکہ کے علاوہ وقتاً فوقتاً دنیا کے تمام ممالک اس میں شریک رہے ہیں، یہاں تک کہ شکست خوردہ ممالک جرمنی، آسٹریا، ہنگری، ترکی وغیرہ کو بھی اس میں شریک کر لیا گیا۔ اس کی ایک کونسل، ایک اسمبلی، ایک معتمدی، اور ایک عدالت بھی اور یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ بین اقوامی بھی ایک سیاسی مملکت کی طرح ہو جائیگی اس کا موازنہ ۲½ کروڑ طلائی فرانک یا تقریباً دو کروڑ روپیہ سالانہ کا تھا جو ہر مملکت کی اہمیت کے اعتبار سے تقسیم کیا جاتا تھا۔ خود ہمارا ہندوستان بھی اس کا رکن تھا اور شائد اب بھی ہے، چنانچہ اس کا چندہ کم و بیش دس لاکھ روپیہ سالانہ جاتا ہے۔ جو علاقے جرمنی اور ترکی سے فتح کئے گئے تھے ان پر اس انجمن نے گویا قبضہ کرکے انھیں اپنے بڑے بڑے مؤیدوں یعنی انگلستان، فرانس، جاپان اور بلجیم میں تقسیم کر دیا اور باقی مفتوحہ ممالک کے حصے بخرے کرکے ایک حد تک قومیت کے اصول پر یورپ کی تقسیم کر دی۔ لیکن اس انجمن کے ڈھانچے میں سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ خود اس کے ارکان میں خود غرضی کا مادّہ تھا، اور بہت جلد یہ محسوس ہونے لگا کہ بین اقوامی مفاد کو کسی فوری خطرے پر قربان کیا جا سکتا ہے جب جاپان نے منچوریا پر بغیر کسی سبب کے قبضہ کیا تو انجمن اقوام نے ایک زبردست کمیشن تحقیقات کے لئے بھیجی، لیکن جب اس کمیشن نے جاپان کو ملزم ٹھیرا تو انجمن کی ہمت نہ ہوئی کہ حسب عہد نامہ انجمن اس کا معاشی مقابلہ مقاطعہ کیا جائے یا اسکے

خلاف فوج کشی کی جائے۔ اس سے انجمن کے دشمنوں کے حوصلے بڑھے اور اٹلی نے
ایک ایسے ملک پر بغیر اعلان جنگ کے حملہ کر دیا جو اسی انجمن میں کارکن تھا، یعنی
حبش۔ معاشی مقاطعے کی تہدیدیں عائد کرنے پر بڑی بڑی تقریریں ہوئیں، بڑی بڑی
قراردادیں منظور ہوئیں لیکن عمل کے فقدان کی وجہ سے اٹلی پر ذرہ برابر نہیں ہوا
اور ایک قدیم سلطنت کو بے شرمی کے ساتھ ہضم کر لیا گیا۔ پہلے جاپان پھر جرمنی پھر
اٹلی انجمن سے علیحدہ ہو گئے اس کے بعد جو ہوا وہ سب حال کے واقعات ہیں آسٹریا
چیکوسلوواکیہ، یونان، فنلستان، بلجیم، ولندستان، ڈنمارک، ناروے، کس کس کا قصہ
گنایا جائے۔ اب سنا ہے کہ انجمن کے معاشی ادارات، امریکہ منتقل ہو گئے ہیں، سیاسی
ادارات کا علم نہیں کہ کہاں ہیں۔

حقیقت میں جیسا بین اقوامی قانون کے ایک بڑے عالم نے کہا ہے
یہ قانون صرف اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب کسی مملکت کو دوسری مملکت پر
غیر معمولی تفوق حاصل نہ ہو اور بین اقوامیت کا احساس اس وقت ممکن ہے
جب عمومیت کا راج ہو اور مختلف مملکتیں ایک ہی اخلاقی اور روحانی سطح پر
پہونچ جائیں۔ آمریت ایک غیر ذمہ دارانہ ادارہ ہے جس کے ساتھ بین اقوامی
ذمہ داری کا احساس باقی نہیں رہ سکتا۔ بین اقوامی سیاسیات کا دارومدار باہمی
رواداری، باہمی مساوات، اور باہمی اخلاقی برتری پہ ہے اور اس وقت تو اس میں سے
ایک بھی بات نظر نہیں آتی۔ بظاہر دنیا اسی قعر مذلت کی طرف دوڑی جا رہی ہے
جس سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ایک امی عرب نے اسے بچایا تھا۔

سیاسیات

(یکم اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء)

لاسلکی نشر گاہ حیدرآباد کے پیش نامے میں یہ عنوان دیکھ کر بعض لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے خیالات موجزن ہو تے ہوں گے۔ آج کل کی فضا کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ تقریباً ہر شخص اپنے آپ کو اُس فن کا جسے وہ سیاسیات سمجھتا ہے ماہر تصور کرتا ہے بلکہ بغیر کسی قسم کے بدارج طے کئے ہوئے ایک ہی روز میں سیاسی رہنما بھی بن جاتا ہے اور وقت ناوقت ہر قسم کے معاملوں کے متعلق "بیانات" شائع کرنا اپنا فرض عین سمجھنے لگتا ہے۔ بعض مرتبہ تو کسی بیان ہی سے بیان دینے والے ماہر سیاسیات کا نام سب سے پہلے سننے میں آتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض مہربان اس عنوان کو دیکھ کر سمجھنے لگیں کہ شاید اس نشر گاہ کے ذریعے سے کسی خاص مسئلے پر کوئی بیان دینے حاضر ہوا ہوں۔ بعض ایسے بھی ہوں گے جنھوں نے یہ تو بھانپ لیا ہوگا کہ اس گفتگو میں سیاسیات کا مفہوم بتایا جائے گا لیکن اسے میری گستاخی سمجھتے ہوں گے کہ ایسے مسئلے کی تفہیم کی جارہی ہے جس سے آج کل کا کم و بیش ہر شخص واقف ہے۔ ایسے احباب سے معافی چاہتے ہوئے یہ عرض کروں گا کہ ہر مسئلے کے

مختلف پہلو ہوتے ہیں اور ممکن ہے کہ آج کی صحبت میں کوئی ایسی بات نکل آئے جس سے سامعین کی وسیع معلومات میں اضافہ ہو جائے۔

سیاسیات اتنا ہی قدیم علم ہے جتنا خود انسان، اور جس طرح حکمیات کے نکات بتدریج معلوم ہوتے گئے ہیں اسی طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیاسی نکات بھی آہستہ آہستہ معلوم ہوتے جا رہے ہیں۔ حکیم ارسطو کا قول ہے کہ انسان ایک سیاسی حیوان ہے، یعنی وہ کسی نہ کسی طرح کی تنظیم سے نکل ہی نہیں سکتا۔ یہ بات اس وقت ہماری سمجھ میں آئے گی جب ہم سیاسیات کے اصلی مفہوم سے واقف ہو جائیں گے دیکھئے۔ انسان کی دو بالکل مختلف حیثیتیں ہیں، ایک محض ذاتی حیثیت اور دوسری وہ حیثیت جس کے اثرات براہ راست دوسروں پر پڑتے ہیں۔ کوئی کیا کھاتا ہے، کتنی دیر رات کو سوتا ہے، کس استاد سے تعلیم پائی ہے، کس دوکان سے اپنی ضروریات خریدتا ہے، یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کا اثر براہ راست سماج پر نہیں پڑتا۔ اس کے برخلاف ہر انسان کو دوسرے انسانوں سے تعلقات پیدا کرتے لازمی ہیں۔ خاندانی تعلقات جو باپ، بیٹے، ماں، بیوی، بیٹی سے ہوتے ہیں انہیں نظر انداز کر دیا جائے تو بھی کوئی بشر ایسا نہیں جس کے تعلقات دوسروں سے نہ ہوں۔ ہم سب نے رابنسن کیرو سو کا ذکر سنا ہوگا۔ کہتے ہیں کہ رابنسن کا جہاز طوفان میں برباد ہو گیا اور وہ ایک تختے پر بیٹھا کسی ویران جزیرے میں پہونچ گیا جہاں آبادی کا بظاہر نام نشان نہ تھا۔ گو وہ اپنے طوطے اور اپنی بکری سے جی بہلایا کرتا تھا لیکن اپنے کسی ہم جنس کے نہ ہونے کی وجہ سے اسے بڑی پریشانی تھی اور جب اسے ریت پر ایک انسانی پاؤں کا نشان ملا تو گو وہ اس سے واقف نہ تھا کہ پاؤں کا نشان کس کا ہے، کالے کا ہے

یا گورے کا۔ مگر فی نفسہ ایک انسان کے پاؤں کا نشان اس کی خوشی اور مسرت کے لئے بالکل کافی تھا۔ غرض دوسرے بنی نوع انسان کے ساتھ ربط ضبط قائم کرنے کا یہ جذبہ ہے جو ہر شخص کو کسی نہ کسی سماج یا معاشرے کا رکن بننے پر مجبور کرتا ہے۔

اگر معاشرہ انسان کی سرشت میں داخل ہے تو ضرور ہے کہ اسے مستحکم کیا جائے اور کسی قسم کے انتشار سے محفوظ کیا جائے۔ چار پانچ آدمی بیٹھے ہوں تو ان کے لئے بھی تنظیم کی ضرورت ہے، ورنہ اگر اس محفل میں ہر شخص جب اس کے من میں آئے بولنے لگے تو خلفشار کی حد نہ رہے گی، اور جب سوال ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں کے افعال کا ہو تو تنظیم کی بسا ضرورت ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنی زیادہ آبادی ہوگی اتنی ہی زیادہ سختی کے ساتھ نظم قائم رکھنا ہوگا۔ تہذیب، جس سے شائستگی کا مفہوم لیا جاتا ہے، اس کے معنے ہی ترتیب و تنظیم کے ہیں۔ اگر انسانوں کے کسی مجموعے کی تنظیم ڈھیلی ڈھالی ہوگی، یا بالکل نہ ہوگی، تو اس کی وقعت ایک غول بیابانی سے زیادہ نہ ہوسکے گی اور اس کی قوت مدافعت اتنی گھٹ جائے گی کہ وہ ہمیشہ اپنے سے زیادہ مرتب و منظم مجموعوں کا شکار بنا رہے گا۔

تنظیم و ترتیب کے لئے لازم ہے کہ انسانوں کی آبادی میں کوئی ایک شخصیت ایسی ہونی چاہیئے جس کے احکام ہر فرد عام طور سے مانے، اور اگر کوئی انھیں ماننے سے انکار کرے تو اسے سزا دے کر مجبور کر سکے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ شخصیت کسی ایک فرد کی ذات ہو بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایک مرکب ہیئت ہو جو مجموعی طور پر احکام صادر کرے۔ یہ احکام قوانین کہلاتے ہیں جو در اصل معاشرے یا سماج کو منظم کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اگر اس جماعت کے افراد اپنے ہم کاری اور تعاون سے اس جماعت کو

منظم نہ رکھنا چاہیں اور ان احکام یا قوانین سے روگردانی کرنا اپنا شیوہ سمجھ لیں جو سماج کے استحکام کے لئے وضع کئے گئے ہوں تو حاکم شخصیت کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور ممکن ہے کہ آخرکار یہ اچھی خاصی منظم جماعت بے ربط غول کی شکل میں تبدیل ہو جائے۔ الغرض اگر معاشرے یا سماج کو قائم رکھنا ہے تو لازم ہے کہ افراد میں آپس میں مل جل کر کام کرنے کی خواہش اور صلاحیت ہو اور ان کا نصب العین یہ ہو کہ جہاں تک ہو سکے وہ اپنے عزیز معاشرے کو منتشر نہ ہونے دیں گے۔

قانونی پابندیاں دراصل آزادی میں سد راہ نہیں ہوتیں بلکہ چونکہ طبائع مختلف ہوتے ہیں اس لئے زیادہ طاقتور یا زیادہ اثر انداز طبائع کو قابو میں رکھ کر انفرادی آزادی کے ایک جزو کو ممکن بناتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سب انسان ایک سے نہیں ہوتے۔ کوئی عقلمند ہے تو کوئی بے وقوف، ایک امیر ہے تو دوسرا غریب۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے:-

یکے پاسبان و یکے پادشاہ — یکے داد خواہ و یکے تاج خواہ
یکے شادمان و یکے دردمند — یکے کامران و یکے مستمند
یکے باجدار و یکے تاجدار — یکے سرفراز و یکے خاکسار
یکے بر حصیر و یکے بر سریر — یکے در پلاس و یکے در حریر

غرض اگر ایک ہی مقام کے جملہ افراد کو باہم سیاسی طور پر منسلک ہو جانے کی ہدایت کر کے چھوڑ دیا جائے تو اس جماعت کے افراد میں جو لوگ اپنی سیادت کے خواہاں ہوں گے ان میں بلاشبہ لڑائی جھگڑے بلکہ شاید کشت و خون تک کی نوبت آ جائے گی

اس سے معلوم ہوا کہ تنظیم قائم رکھنے کے لئے کسی نہ کسی تہدید کی ضرورت ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تہدیدی احکام یعنی قوانین کون بناتا ہے، کون نافذ کرتا ہے اور کون مختلف مقدمات پر ان کا انطباق کرتا ہے۔ اگر قوانین بنانے والے یا بنانے والوں پر لوگوں کو اعتماد ہو تو ظاہر ہے کہ لوگ آسانی سے قابو میں آجائیں گے اور ملک کی تنظیم میں خوشی خاطر ہاتھ بٹائیں گے ورنہ زیادہ سختی کی ضرورت ہوگی اور ممکن ہے کہ اگر رعایا کی طرف سے بغاوت یا انقلاب کی دھمکی دی جائے تو جو لوگ امن و امان کے ذمہ دار ہوں گے وہ انتہائی سخت گیری پر مجبور ہو جائیں۔

اسی لئے سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ قانون بنانے والے رعایا کا اعتبار اور اعتماد حاصل کریں۔ جب قانون بن گیا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی خاص مقدمے یا مقدمات پر اس کا اطلاق کیسے کیا جائے۔ یہ کام منصفوں، ججوں اور عدالت عالیہ کے ارکان کے سپرد ہوتا ہے اور ان سے یہ امید کی جاتی ہے کہ بلا کسی قسم کے رو رعایت کے محض قانون مروّجہ کو سامنے رکھ کر غایت ایمانداری کے ساتھ اُن سب مقدمات کا فیصلہ کریں جو ان کے سامنے لائے جائیں۔ پھر اس خیال سے کہ آخر منصف اور جج بھی انسان ہوتے ہیں، ممکن ہے کہ مقدمے کے تصفیہ میں کوئی غلطی سرزد ہو جائے، تقریباً ہر بڑے مقدمے میں مرافعوں کا سلسلہ قائم کر دیا جاتا ہے کہ جہاں تک ہوسکے غیر جانبدارانہ انصاف کا خون نہ ہونے پائے۔ اس تمام انتظام اور عام نگرانی کی خاطر، نیز ججوں کے احکام کو عمل میں لانے، مالیات کو منظم کرنے، ملک کو اغیار کی دست برد سے بچانے، رعایا کے آرام و آسائش ان کی تعلیم و حفظان صحت کے قوانین کی صحیح تاویل کرنے اور ان کا نفاذ کرنے کے لئے وزرا، معتمد، ناظم اور ان کے ماتحت

ہوتے ہیں جو ملک کے انتظام کے گویا ولی ہوتے ہیں اور بیشتر حد تک ملک کی بہبود
کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہ بھی کافی نہیں، بلکہ جیسے کوئی دائرہ بغیر مرکز کے نہیں بن سکتا
اسی طرح ملک کی تنظیم کا مرکز اعلیٰ سلطنتوں میں بادشاہ یا جمہوریوں میں صدر کی ذات
ہوتی ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ اگر ہر شخص کو اپنی تمام خواہشات پوری کرنے کی آزادی ہو تو
پھر سماج کی تنظیم باقی نہیں رہتی۔ بہت سے انسانوں کی فطری یکسانی کا تقاضا ہوتا ہے
کہ وہ سب کسی نفیس یا خوبصورت یا کارآمد چیز کو پسند کریں اور اگر ان میں سے ہر ایک کو
یہ حق حاصل ہو کہ وہ اس چیز پر قابض ہو جائے تو پھر ملک میں جھگڑوں ٹنٹوں کا بازار
گرم ہو جائے گا اور نفسی نفسی پڑ جائے گی۔ فرض کیجئے کہ ہر شخص کو سڑک کے جس طرف
چاہے اپنی گاڑی چلانے یا خود چلنے کی آزادی ہو تو پھر روزمرہ گاڑیوں کی ٹکروں اور
لوگوں کی مسلسل ہلچل کی وجہ سے کیا کچھ کشت و خون نہ ہونے لگیں۔ اسی لیے اس نام نہاد
آزادی میں اتنی حد بندی ضروری ہے کہ انسان کو حالات اور واقعات کے اعتبار سے
زیادہ سے زیادہ خود مختاری رہے اور جہاں تک ہو سکے تصادم اور جھگڑے کی نوبت
نہ آنے پائے۔

اب آپ مختصر طور پر سیاسیات کا مفہوم سمجھ گئے ہوں گے۔ سیاسیات
اصل میں حکومت کے کل پرزوں، حکومت کے ارکان کے باہمی تعلقات اور حکومت اور
رعایا کے باہمی روابط کا علم ہے۔ اگر یہ تعلقات خوش اسلوبی اور باہمی اعتماد پر مبنی ہوں گے
تو ملک کا بھلا ہوگا اور اس میں مرفہ الحالی اور سیر چشمی پیدا ہوگی؛ اگر خدانخواستہ باہمی
اعتماد نہ ہوگا تو رعایا کی بہبود، اس کی تنظیم، معاشرہ، سماج سب خطرے میں پڑ جائیں گے

اور ملک کی قوت ایسی منتشر ہو جائے گی کہ جو چاہے گا اسے فنا کر دے گا۔

روزہ

(۲ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء)

وہ مبارک مہینہ جس کا ہر مسلمان کو پورے دس مہینے انتظار رہتا ہے آپہونچا ہے اور کل سے ہر اس شخص کا روزمرّہ کا پیش نامہ بالکل بدل جائے گا جو احکام اسلامی پر عمل کرنا اپنا وطیرہ سمجھتا ہو۔ تبدیلی کی خواہش انسانی کی فطرت میں بھری ہوئی ہے۔ یہ ایک عام بات ہے کہ ہم ایک ہی کام کرتے کرتے اکتا جاتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ بالکل دوسرے کام میں لگ جائیں۔ کہتے ہیں فلاں شخص لگاتار چار گھنٹے کام کرنے سے بھی نہیں اکتاتا جس کے دوسرے معنے یہ ہوئے کہ یہ ایک مستثنیات سے ہے کہ کوئی شخص لگاتار اس سے زیادہ کام کرے اور عام طور پر اس سے کم ہی کام کرنے کے بعد انسان چاہتا ہے کہ کم از کم تھوڑی دیر تک دل بہلائے یعنی کسی دوسرے کام میں لگ جاتے۔ مسلسل پڑھنے کے بعد تفریح کو اور تفریح کے بعد پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر ہمارا باورچی ہمیشہ ایک ہی طرح کا سالن پکایا کرے خواہ وہ سالن کیسا ہی مزیدار کیوں نہ ہو، تین چار روز ہی بعد ہم اس سے اکتا جائیں گے یہی کیفیت چھٹی کی بھی ہے چھٹیاں در اصل ان لوگوں کے لئے ہوتی ہیں جو لگاتار ایک ہی طرح کا کام کئی روز تک کرتے ہیں

انگریزوں کا کم سے کم اس جنگ سے پہلے یہ وطیرہ تھا کہ پیر کے دن سے سنیچر تک مشین کی طرح کام کرتے تھے اور اتوار کے دن اپنا تمام پیش نامہ محض تبدیلی کی خاطر تہہ و بالا کر دیتے تھے۔ وہ انگریز جو گھڑی کی کھٹ کھٹ پر ٹھیک ۸ یا ۹ بجے صبح کا ناشتہ کرتا تھا، اتوار کے دن اسے ناشتے کی نوبت صبح سے ایک بجے تک کسی وقت بھی آتی تھی اور بعض مرتبہ تو آتی ہی نہ تھی۔ Week end کی چھٹی کے کیا معنے ہیں؟ صرف یہی کہ سنیچر آیا اور صاحب بہادر ہینڈ بیگ لے کر کسی دوسرے شہر یا گاؤں کو چلے گئے، اور پیر کی صبح تک بالکل بھول گئے کہ یہ کسی کا پابند بھی ہوں اور پیر کے دن پھر اپنے کام پر آ گئے۔

بہرحال تبدیلی کی خواہش ہماری طینت میں ہے یہی کیفیت ہمارے جسم کی بھی ہے۔ ہم کسی روز زیادہ کھانا کھا لیتے ہیں تو خواہی نخواہی دوسرے وقت کم کھاتے ہیں یا کھانے کو بالکل جی نہیں چاہتا۔ پرانے اطبائے یونانی کو فاقہ کرانے میں کمال حاصل تھا اور بات بات پر تنقیہ کراتے تھے۔ میرے بچپن کی بات ہے کہ ہمارے یہاں ایک حکیم صاحب ملازم تھے جن کا سب سے سہل اور ظاہر ہے کہ سب سے سستا نسخہ یہ تھا کہ بس لیا اور فاقہ کرا دیا۔ انھیں ہم سب حکیم فاقہ کش کہتے تھے۔ یوں تو یہ ایک مضحکہ خیز سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ خدا نے ان کے ہاتھ میں بڑی شفا دی تھی۔ غرض یہ ہے کہ جس طرح ہمارا دماغ راحت یعنی تبدیلی کا رُخ ڈھونڈھتا ہے اسی طرح ہمارے اعضا خصوصاً اندرونی اعضا چاہتے ہیں کہ روزمرہ کی یکسانی سے انھیں کسی طرح سے نجات اور تزکیہ جسمانی کا موقع ملے۔ خدا نے ہماری روحانی اور جسمانی دونوں شخصیتیں کچھ ایسی بنائی ہیں کہ انہیں

ہر وقت گویا میل چڑھتا رہتا ہے، اور جس طرح سے کہ ہم دن میں کئی مرتبہ اپنا منھ ہاتھ دھوتے ہیں اور دانت مانجھتے ہیں اور ہفتہ میں کئی مرتبہ اپنا تمام بدن دھوتے ہیں اسی طرح ضرورت اس کی ہے کہ کبھی کبھی ہم اپنے اندرونی روحانی اور مادی جسم کو ان آلائشوں سے پاک کرنے کی کوشش کریں جن سے وہ ملبوس ہو گئی ہوں روزہ در اصل اسی کوشش کا نام ہے۔

دنیا میں کوئی مذہب اور کوئی سماج ایسا نہیں گذرا جس میں روزہ کو جزو ایمان نہ سمجھا گیا ہو یہودیوں اور عیسائیوں میں علاوہ ۴۰ دن کے روزوں کے بعض دوسرے تہوار بھی ہیں جن میں روزہ رکھنا فرض سمجھا گیا ہے۔ مثلاً عاشورۂ محرم کے دن یہودی عام طور سے روزہ رکھتے تھے اس لئے کہ روایت کے بموجب یہی وہ دن تھا جب فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرتے ہوئے بحر احمر کی کھاڑی میں غرق ہوا تھا۔ اسی طرح ہندوؤں میں بھی چند خاص دنوں میں روزہ رکھا جاتا ہے، اور حال میں تو مہاتما گاندھی نے اس ہندوانی روزے کو سیاسی آلہ کار بنا کر ہر کس و ناکس کو اس سے واقف کرا دیا ہے۔ یہاں اس وقت اس سے بحث مقصود نہیں کہ آیا روزے کو، جس کا تعلق کسی ایک فرد کی ذات سے ہوتا ہے، سیاسی معاملات میں آلہ کار بنانا چاہئے یا نہیں یا فی نفسہٖ اس کا کوئی ربط معاملات عامّہ سے ہو سکتا ہے، بلکہ اس وقت اس کے ذکر سے مقصود صرف یہ ہے کہ ہر مذہب اور ہر ملک کے تحت چند خاص حالات میں روزے کو جسمانی اور روحانی نجاست کو دور کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے یا کسی تبرک یادگار کو قائم رکھنے کا کام لیا جاتا ہے۔ لیکن اس ضمن میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بہت سے مذہبوں والے جو روزہ رکھتے ہیں اس میں وہ بعض کھانے پینے کی چیزیں

جائز رکھتے ہیں، مثلاً بعض مذہب والے دودھ پینے، بعض پانی پینے، بعض ہلکی غذائیں کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے اور اس طرح انھیں اپنے نفس کے ضبط کی اتنی حالت نہیں ہوتی جتنی اس شخص کو جو خدا کی دی ہوئی نعمتوں کے ہوتے ہوئے، اور سامنے ہوتے ہوئے ان سے پرہیز کرے۔

اسلام نے جس قسم کے روزے کو فرض کیا اس کی ماہیت سمجھنی ضروری ہے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ روزے کا مقصد صرف یہ ہے کہ صبح سے رات تک کھانا پینا ترک کر دیا، اطمینان سے طلوع آفتاب کے بعد اٹھے، دوپہر کو چادر تان کر سوتے تو چار بج گئے اور کسی نے اعتراض کیا تو جواب دیا کہ صاحب آپ کو معلوم نہیں روزہ ہے اور روزے میں کیا دوپہر کے وقت ہم ادھر ادھر پھرا کریں۔ چار بجے ہوش آیا تو افطار کی پڑی، اور اس کی پیش بندی کی طور پر ذرا ذراسی بات پر غصے میں بھرنے لگے، مکان سر پر رکھ لیا، جیسے تیسے مغرب کی اذان ہوئی خوب پیٹ بھر کر ثقیل غذائیں کھائیں تاکہ خلو جلد نہ ہو، نماز پڑھنا ہو تو نماز پڑھی اس کے بعد ڈٹ کر ناک تک پیٹ بھرا، پھر رات تو اپنی ہی ہے، مجلس احباب، سنیما، تھیٹر موجود ہیں، دوپہر کو آرام سے نیند آہی چکی ہے، لیجئے سحری کا وقت بھی آگیا اور فکر ہوئی کہ کیا چیز کتنی کھائی جائے کہ دن میں روزے کا پتہ بھی نہ لگے، سحری کے بعد جو سوئے تو بس حسب معمول سورج نکلنے کے بعد کہیں اٹھنا نصیب ہوا۔ خیال فرمائے کہ اس قسم کے روزے کا افادی پہلو کیا ہو سکتا تھا۔ کیا یہی روزہ تھا جس کا اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلامؑ کے ذریعے سے حکم دیا تھا،

ظاہر ہے کہ روزہ صرف فاقہ کشی کا نام نہیں ہو سکتا ورنہ ہر وہ شخص جسے

دوپہر کو روٹی نہ ملتی ہو روزہ دار ہونا اور ہر گدا گر آسانی سے صائم الدہر بن جاتا۔ روزے
کے فرض ہونے کے متعلق جو آیتیں کلام مجید میں ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں
کے لئے اسی طرح سے روزے فرض کئے گئے ہیں جیسے ان قوموں کے لئے جو ان سے پہلے
ہو گزری ہیں، اور وہ صرف گنتی کے چند دن ہیں؛ نیز روزے کا سب سے بڑا مقصد
جو بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے انسان میں اتقا یا پرہیز گاری پیدا ہوتی ہے
پھر ایک دوسری جگہ یہ فرمایا گیا ہے کہ رمضان کے مہینے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں
قرآن مجید نازل ہوا۔ رمضان شریف کے برکت والا مہینہ ہونے کی اس سے زیادہ
کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ اس میں وہ کتاب نازل ہوئی جسے تمام عالم میں ایک عظیم الشان
کامیاب انقلاب برپا کر دیا اور جس کی وہ آیت شریف جو سب سے پہلے نازل ہوئی
"اقراء" یعنی پڑھنے کے حکم سے شروع ہوئی تھی، جس نے اس مذہب اور ملت کو قائم
کیا جس میں کالی، زنگی، شاہی کی کوئی تفریق نہ تھی اور اگر کوئی امتیاز تھا تو بس تقویٰ تھا،
جس کے نافذ کرنے والے کے وسائل لاتعداد تھے لیکن جس نے اپنی زندگی جو کی روٹی
اور پیوند لگے ہوئے کپڑوں پر بسر کی، اور اس طرح ایک عظیم الشان مثال قائم کی یہ
یہ وہ باتیں ہیں جو اس مہینے کو باقی تمام مہینوں سے زیادہ افضل بنا دیتی ہیں۔

غرض یہ کہ روزے کا منشا اور مقصد یہ قرار دیا گیا ہے کہ اس سے اتقا
یعنی تزکیہ نفس پیدا ہو یعنی وہ جذبہ جو دراصل انسان کو باقی جانداروں سے ممتاز کرتا
ہے۔ ہم میں اور جانوروں میں آخر کیا چیزیں مابہ الامتیاز ہیں؟ یہی تو کہ جانور جو چیز ان کے
سامنے پڑی ہو اسے کھانے اور برتنے لگتے ہیں اور عقلمند انسان جو کھاتا پیتا ہے اور
برتتا ہے اسے سوچ سمجھ کر کھاتا پیتا اور برتتا ہے۔ خالص آزادی یعنی وہ آزادی

جس سے دوسروں کو گزند پہونچے نقصان رساں ہے اسی لئے ہمارے لئے قوانین
بنائے جاتے ہیں تاکہ ہم کم سے کم پابندی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ آزادی کے ساتھ
اپنی زندگی بسر کر سکیں اور دوسروں کو ہماری حرکات سے نقصان پہونچنے کا کم سے کم
احتمال رہے۔ ظاہر ہے کہ سماجی قوانین کی پابندی کرنے کے لئے ایک طرح کی
طویل تادیب کی ضرورت ہوگی اور گو اس تادیب کے دوران میں بظاہر دقتیں
اٹھانی پڑتی ہوں لیکن خوش آیند نتائج کے اعتبار سے یہ سب دقتیں سہل جاتی ہیں۔
جن ملکوں میں جبری فوجی خدمت لازمی ہوتی ہے وہاں ہر شہری کو سال میں چند ہفتے
ٹریننگ حاصل کرنی پڑتی ہے، پھر اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اسی قسم کی ٹریننگ
سال میں ایک مہینے ہر مسلمان پر لازمی ہے تاکہ وہ آسائش دنیوی کے ہوتے ہوئے
اپنے نفس کو مارے اور وہ ٹریننگ حاصل کرے، جس کے بغیر اسے حقیقی تقوے اور
فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔

غرض یہ ہے کہ روزے کا سب سے بڑا منشا یہ ہے کہ ہر قسم کی آسائش کے
ہوتے ہوئے انسان کو ضبط نفس کے لئے سال میں ایک مہینے کی ٹریننگ دی جائے
روزے کا مقصد ہرگز محض فاقہ نہیں ہے۔ روزے میں جس طرح کھانا پینا منع ہے اسی طرح
یہ بھی منع ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے بری باتیں دیکھیں یا اپنی زبان سے جھوٹ، غیبت، گالی گلوچ
نکالیں یا اپنے کانوں سے مذموم باتیں سنیں۔ ہمیں چاہئے کہ روزے میں بجائے
غصے سے مغلوب رہنے کے ہم دوسرے مہینوں سے زیادہ حلم اور آشتی اپنے میں
پیدا کریں اور جہاں تک ہو سکے بری باتوں سے پرہیز کریں۔ جس طرح روزہ کھانا کھانے
یا پانی پینے سے ٹوٹ جائے گا ویسے ہی کسی کے پیٹھ پیچھے اس کی چغل خوری، کسی کے

نقصان کے درپے رہتے' بری بات منھ سے نکالنے یا بری بات سننے کی طرف توجہ کرنے سے بھی روزہ باقی نہیں رہے گا۔ ہر انسان میں نیکی اور بدی دونوں کی قوتیں ہیں۔ ہم جو کام کرتے ہیں اسکی ابتدا کے وقت ہم میں دو قسم کی تحریکیں ہوتی ہیں؛ اگر کام اچھا ہے تو شیطانی تحریک ہمیں اس کام کرنے سے روکتی ہے اور برا ہے تو اس کے لئے ابھارتی ہے؛ اس کے برعکس ہم میں جو رحمانی تحریک ہے وہ برے کام سے روکتی ہے اور اچھے کام پر ہمیں ابھارتی ہے۔ کہتے ہیں کہ رمضان شریف میں شیطان مقید رہتا ہے؛ لیکن میں یہ کہوں گا کہ یہ صرف ان روزہ داروں کے لئے مقید رہتا ہے جو اسے اپنے نیک افعال' انسانی ہمدردی' حلم اور اچھے کردار سے اسے مقید رکھتے ہیں؛ اور ایسے فاقہ مست جو رات بھر پیٹ بھرتے ہیں اور دن میں اپنے بھائیوں کا گلا کاٹنے یا ان کی برائیاں کرنے یا دوسرے برے کام کرنے میں مصروف رہیں وہ تو شیطان کو مقید نہیں کرتے بلکہ اس کی بیڑیاں کاٹنے میں مدد کرتے ہیں۔

آنحضرت صلعم مکہ میں تھے کہ نماز فرض ہوئی اور روزہ اس وقت تک فرض نہیں ہوا جب تک کہ وہ ہجرت کرکے مدینہ تشریف نہ لے گئے۔ اس میں ایک اہم نکتہ ہے۔ مکہ معظمہ میں تو آنحضرت صلعم کے پیروں کی تعداد نہایت کم تھی اور ان میں سے اکثر مفلوک الحال تھے؛ وہاں روزہ فرض ہوتا تو اس کا اخلاقی اثر اتنا نہ ہوتا۔ لیکن مدینہ منورہ میں صورت حال بالکل دوسری تھی۔ جوق جوق لوگ اسلامی گروہ میں شامل ہو رہے تھے؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر ابتدا ہی سے اتنا اعتماد تھا کہ یہودی اور عیسائی تک ان کے حکم پر چلنے کے لئے تیار رہتے تھے' دور دور کے

ملکوں کے ساتھ تجارت تھی اور مال و اسباب کی کمی نہ تھی۔ روزہ ایسی مرفہ الحالی کی فضا میں فرض کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے صبر و شکر کے جذبات کو روزے کے ساتھ آزمایا اور اس طرح ہمیشہ کے لئے اسے ایک معیار قرار دے دیا جس سے ہمیں ضبط و تحمل کا سبق حاصل ہو اور ہم ان بیچارے غریبوں کی مصیبت کا تھوڑا بہت اندازہ کر لیں جنھیں مجبوراً فاقہ کرنا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سکندر اعظم کا اتالیق حکیم ارسطاطالیس اپنے شاگرد کو بعض مرتبہ جان بوجھ کر فاقہ کرایا کرتا تھا۔ لوگوں نے حکیم سے پوچھا کہ ایسا کیوں کرتے ہو تو اس نے جواب دیا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے معزز شاگرد کو بھوک پیاس کی تکلیف کا احساس ہو تاکہ جب وقت آئے اور وہ بادشاہ بنے تو اپنی غریب مفلوک الحال رعایا کی فلاح و بہبود کی کوشش ہمدردی اور خصوصیت کے ساتھ کرے۔ روزے میں یہی حکمت رکھی گئی ہے کہ مسلمان بھوک پیاس کی تکلیف کا اندازہ کر سکیں اور بھوکے پیاسے بھائیوں کو بجائے حقارت کے ہمدردی سے دیکھیں تاکہ ان کے دلوں میں ان کی عملی مدد کی تحریک پیدا ہو۔

صحیح روزہ ہمیں صابر و شاکر، ہمدرد انسان، متحمل اور بردبار بناتا ہے اور اس سے ایک بڑی معاشرتی اور اخلاقی اصلاح مقصود ہے۔ جو لوگ بظاہر روزہ رکھتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس مبارک مہینے میں ناجائز طور پر لوگوں کا مال کھانے، خدا کے بندوں کے حقوق غصب کرنے، اعزہ و اقارب کے فرائض پامال کرنے اپنے بھائیوں کی غیبتیں کرنے اور انھیں تکلیفیں پہونچانے میں مضائقہ نہیں سمجھتے وہ اس مقصود سے دور جا پڑتے ہیں اور غیروں کو طعن و تشنیع کا موقعہ دیتے ہیں۔

خدا تعالےٰ ہم سب کو اپنے احکام کی پابندی کی توفیق دے۔ تاکہ اس کے

نام لیوا پھر دنیا کی ہر جہتی ترقی میں سب سے پیش پیش نظر آئیں۔

ڈنمارک

(۲۶ نومبر سنہ ۱۹۴۰ء)

ڈنمارک شمالی یورپ کا ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کا رقبہ صرف ۱۶ ہزار مربع میل اور آبادی ۳۷ لاکھ، یعنی ہمارے ممالک محروسہ حیدر آباد کے ایک صوبہ کی برابر ہے۔ گو ملک بہت چھوٹا ہے لیکن تاریخ میں اس نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں اور اب بھی اس کے باشندوں میں بڑا حوصلہ ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ کم و بیش ایک ہزار برس پہلے یہاں کے ایک بادشاہ کینوٹ نے صرف اپنے ہمسایہ ممالک پر ہی قبضہ کرنا کافی نہیں سمجھا بلکہ چھوٹی چھوٹی پتواری کشتیوں میں فوج کو بٹھا کر بحیرہ شمالی کو پار کیا اور تقریباً تمام برطانیہ پر قبضہ کر لیا۔ کینوٹ کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے۔ وہ ایسا حوصلہ مند اور مدبر تھا کہ اس نے کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا تھا اور وہ اپنے زعم باطل میں سمجھنے لگا تھا کہ اس کے حکم کی دیر ہے اور ہر کام ہو جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ سمندر کے کنارے بیٹھا ہوا تھا کہ مد و جزر کے قاعدے کے

بموجب سمندر کی لہریں اس کی طرف آنی شروع ہوئیں۔ کینیوٹ کو اپنے حکم پر اتنا زعم تھا کہ اس نے فوراً ہاتھ بڑھایا اور حکم دیا کہ لہرو رک جاؤ اس لئے کہ ڈنمارک کا بادشاہ بیٹھا ہے۔ ظاہر ہے کہ لہریں نہیں رکیں اور خود اسے ہٹنا پڑا۔

خیر یہ تو ایک قصہ ہے جو زبان زد خاص و عام ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی زمانے میں ڈنمارک کی قوت بہت بڑھی ہوئی تھی اور جب نارمن فتح انگلستان کی وجہ سے جزائر برطانیہ میں اس کے لئے میدان نہیں رہا تو اس کے باشندوں نے اپنے ہمسایہ جزیرہ نمائے اسکانڈی نیویا پر ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کئے اور پہلے جنوبی سوئیڈن پر اور بعد میں پورے ناروے پر قابض ہو گئے چنانچہ پندرھویں صدی سے لے کر ۱۸۱۴ء تک ناروے ڈنمارک کے قبضے میں رہا حالانکہ ناروے کا رقبہ ڈنمارک کے رقبے سے کم از کم آٹھ گنا تھا۔ چونکہ نپولینی جنگوں میں ڈنمارک نے نپولین کا ساتھ دیا تھا اس لئے اس کے زوال کے بعد اس ملک کو یہ سزا دی گئی کہ ناروے اس کے قبضہ سے نکال کر سوئیڈن کے تفویض کر دیا گیا۔

انیسویں صدی عیسوی کی ڈنمارک کی تاریخ میں ایک نمایاں اہمیت ہے ڈنمارک نے یہ دیکھ کر کہ وہ چاروں طرف سے بڑی بڑی سلطنتوں سے گھرا ہوا ہے دور دراز ممالک کو زیر اثر لانے کا خیال بالکل ترک کر دیا اور خاموشی سے خود اپنی ترقی کی طرف پوری توجہ مبذول کر لی۔ اس پر بھی اغیار نے اس بیچارے کو چین سے بیٹھنے نہیں دیا اور صدی کے وسط میں اسے اپنے دو زرخیز صوبوں یعنی شلیسویگ اور ہولشٹائن سے ہاتھ دھونے پڑے جن کا ایک چھوٹے سے بہانے پر پروشیا نے بالجبر الحاق کر لیا۔

ڈنمارک نے پچھلی صدی میں جتنی ترقی اپنی بساط کے مطابق کی ہے اس مناسبت سے مشکل سے کسی دوسری قوم نے کی ہوگی۔ چونکہ ملک میں دھات کی کانیں تقریباً معدوم تھیں اس لئے ڈنمارکی لوگ زراعت کو ترقی دینے اور اپنے ملک کی پیداوار بڑھانے کے درپے ہوگئے۔ انھوں نے ریت کے میدانوں میں مچھلی کا کھاد ڈال کر زرخیز بنایا دلدلوں کو جو زمین کے ہمراہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھیں، خشک کیا، دریاؤں کے طاسوں کو کھود کر ان کے پانی کو قرب وجوار کی زمینوں کی سطح سے نیچا کیا، چٹیل میدانوں پر درخت لگائے اور اس طرح ملک کی آمدنی میں کروڑوں روپیہ کا اضافہ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ کسی ملک کے تنگ دست کاشتکاروں کے پاس اتنا روپیہ نہیں ہوتا کہ وہ اچھے اچھے آلوں اور عمدہ قسم کے ہلوں سے کام لیں نہ ان کے پاس کھاد بیج کے لئے کافی رقم ہوتی ہے۔ نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ تاوقتیکہ ملک میں تعلیم کا عام رواج نہ ہو اس وقت تک ملک صحیح معنوں میں ترقی نہیں کر سکتا اور ڈنمارک والے فخریہ کہہ سکتے ہیں کہ دو عظیم تحریکوں میں وہ تمام یورپ کے ملکوں سے آگے رہے ہیں، ایک تو تحریک امداد باہمی میں اور دوسرے عام تعلیم کے لزوم کے مسئلے میں۔ امداد باہمی کی تحریک میں ڈنمارک کسی ملک سے پیچھے نہیں اور اس میں امداد باہمی کی انجمنوں کا گویا جال بچھا ہوا ہے اور ان کے ارکان کی تعداد لاکھوں تک پہونچ گئی ہے۔ کم و بیش ہر کسان کسی نہ کسی انجمن امداد باہمی کا رکن ہے روپیہ کی ضرورت ہو تو انجمن کم منافع پر روپیہ قرض دیتی ہے، کھاد بیج کی ضرورت ہو تو کھاد بیج مہیا کرتی ہے، یہاں تک کہ کسان اپنے گھر کی روشنی کے لئے بجلی بھی انجمن امداد باہمی کے ذریعے سے حاصل کرتا ہے۔ ان طریقوں سے ڈنمارک کا کسان نہایت

مرفہ الحال ہوگیا ہے اور ملک کی زراعتی پیداوار کی اہمیت میں بیحد اضافہ ہوگیا ہے
اور ڈنمارک نہ صرف اپنے لئے سامان خورد و نوش وافر مقدار میں پیدا کرتا ہے بلکہ
باہر بھی بھیجتا ہے۔ یہاں والے موجودہ جنگ سے پہلے۔ ہر سال تقریباً
ایک ارب روپیہ کی کھانے پینے کی چیزیں باہر بھیجتے تھے اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ
انگلستان میں جتنا مکھن اور انڈے خرچ ہوتے تھے ان میں سے دو تہائی مکھن اور انڈے
ڈنمارک سے آتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ منجملہ دوسرے اسباب کے ہٹلر نے اس
بیچارے چھوٹے سے ملک پر جو اپنا قبضہ جمایا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ
یہاں کی زراعتی پیداوار پر قابض ہونا چاہتا تھا۔

شاید کسی ملک میں تعلیم کو لازمی ہوئے اتنا زمانہ نہیں گذرا جتنا ڈنمارک میں
اس لئے کہ یہ ۱۸۱۴ء ہی میں لازمی ہوگئی تھی۔ یہاں ہر لڑکے اور ہر لڑکی کو سات سال
کی عمر سے چودہ سال کی عمر تک کسی نہ کسی مدرسے میں پڑھنا پڑتا ہے۔ اس وقت اس
ذرا سے ملک میں ساڑھے چار ہزار ابتدائی مدارس ہیں اور ان میں ۱۹۳۷ء میں تقریباً
پانچ لاکھ لڑکے لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کا نصاب تعلیم تقریباً ایک سا
ہے صرف فرق یہ ہے کہ لڑکیوں کے لئے سینے پرونے اور پکانے کی تعلیم ضروری ہے
ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ابتدائی جماعتوں میں تو لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتی ہیں
لیکن ثانوی جماعتیں جدا جدا ہیں خواہ مدرسے کی عمارت ایک ہی ہو۔ خانہ داری کے
متعلق ڈنمارک والوں کا عقیدہ ہے کہ جو عورت اپنے گھر کو درست نہ رکھ سکے وہ
ملک یا سماج کے لئے کسی طرح سے مفید نہیں ہوسکتی، چنانچہ نہ صرف یہ کہ خانہ داری کا
مضمون ہر لڑکی کے لئے لازمی ہے بلکہ بعض مدارس ایسے بھی ہیں جہاں لڑکیاں اس

مضمون میں اختصاص بھی پیدا کر سکتی ہیں۔

ڈنمارک والوں کی تعلیمی پالیسی کا ایک جزو یہ ہے کہ اونٹے سے لے کر اعلیٰ اور جامعی تعلیم تک تعلیم کا افادی پہلو نمایاں رہے چنانچہ ہر سیڑھی پر طالب علم میں کسی نہ کسی ایسے پیشے کا رجحان پیدا کیا جاتا ہے جس کے ذریعے سے وہ اپنی روزی آپ پیدا کر سکے اور جامعہ میں بھی ایسے فنون میں طیلسان دئے جاتے ہیں جن کی وجہ سے ملک میں بے کاری نہ پیدا ہو۔ اسی اصول پر ملک میں زراعت، تجارت، دندان سازی، تعلیم المعلمین، صنعت و حرفت کے متعدد کلیات اور مدارس موجود ہیں، چنانچہ کلیہ زراعت میں ۸۰۰ طلبہ، ۷۰۳ صنعتی مدارس میں ۳۶ ہزار افراد ۱۸ مدارس تعلیم المعلمین میں ایک ہزار مرد عورت اور تقریباً ایک سو تجارتی مدارس میں کم و بیش ۱۶ ہزار متعلم تعلیم پاتے ہیں۔ ملک میں دو جامعات ہیں اور تنہا جامعہ کوپن ہاگن میں ۱۹۳۷ء میں ۵۰۰۷ طلبہ زیر تعلیم تھے۔ یہ اس ملک کی تعلیمی جد و جہد کا ذکر ہے جس کا رقبہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے ایک صوبے یا برطانوی ہند کی ایک کمشنری کے رقبے سے زیادہ نہیں ہے۔

ابھی اوپر کہا گیا ہے کہ نپولین کے زمانے سے برابر پروشیا یعنی جرمنی کو ڈنمارک سے کچھ ازلی دشمنی تھی، چنانچہ پچھلی صدی کے وسط میں اس نے دو زرخیز صوبوں پر قبضہ بھی کر لیا تھا۔ شاید اسی کی کاٹ کے طور پر ڈنمارک کے بادشاہ کرسچین نہم نے اپنی لڑکیوں کے لئے یورپ کے بڑے بڑے ملکوں میں بر ڈھونڈنے شروع کئے اور انھیں بعض عظیم الشان ملکوں کی ملکائیں بنانے میں کامیاب ہوا۔ اس کی ایک لڑکی الگزنڈرا ایڈورڈ ہفتم شہنشاہ سلطنت برطانیہ کی ملکہ بنیں اور

اس طرح ملکہ وکٹوریہ کی بہو اور ہز میجسٹی شہنشاہ جارج ششم کی دادی ہوئیں، اور دوسری لڑکی کا نکاح الگزنڈر دوم زار روس سے ہوا۔ لڑکوں کے معاملے میں بھی کرسچین نہم نہایت خوش قسمت نکلا۔ اس کا بڑا لڑکا فریڈرک ہشتم تو اس کے بعد ڈنمارک کا بادشاہ ہوا، چھوٹے جارج کو ۱۸۶۳ء میں یونان کا بادشاہ منتخب کیا گیا، اور جب ۱۹۰۵ء میں ناروے سویڈن کے جوئے سے آزاد ہوا تو اسی کرسچین کا ایک پوتا شاہزادہ کارل ہاکن ہفتم کے لقب سے ناروے کے تخت پر بیٹھا۔ گویا کرسچین نہم کی اولاد شمال میں ناروے، جنوب میں یونان، مشرق میں روس اور مغرب میں انگلستان کی مالک ہوئی۔

آج کل اس بدنصیب ملک پر جس پر جرمنی نے بغیر کسی عذر کے قبضہ کرلیا ہے، کرسچین نہم کا پوتا کرسچین دہم حکمراں ہے۔ یہ ایک دلچسپ اور نہایت اتفاقی بات ہے کہ چار سو برس سے زیادہ سے ڈنمارک کے تخت پر ایک بادشاہ کا لقب کرسچین ہوتا ہے تو دوسرے کا فریڈرک یعنی جتنے کرسچین نام کے بادشاہ ہوئے ہیں اتنے ہی فریڈرک نام کے۔ بادشاہ کا نام کرسچین ہو تو ولی عہد کا نام فریڈرک اور جب فریڈرک تخت پر بیٹھتا ہے تو وہ اپنے ولی عہد کا نام کرسچین رکھ دیتا ہے یا کم از کم یہ ولی عہد تخت پر کرسچین کے لقب سے بیٹھ جاتا ہے۔ اسی قاعدے کے مطابق فریڈرک ہشتم آیا اور اس کی موت پر ۱۹۱۲ء میں کرسچین دہم تخت پر بیٹھا اور اب اس پیشگوئی کے لیے کسی منجم یا رتال کی ضرورت نہیں کہ اگر اس دور ابتلا سے ڈنمارک صحیح و سالم نکل گیا تو کرسچین کے بعد جو بادشاہ ہوگا اس کا لقب فریڈرک نہم ہوگا۔ دنیا کے ہر ملک میں بچے کا نام بڑی جستجو سے نکالا جاتا ہے، ڈنمارک کے بادشاہ کے

بڑے لڑکے کا نام گویا رکھا رکھایا مل جاتا ہے! موجودہ بادشاہ کی عمر ستر برس سے زیادہ کی ہے لیکن بڑے توانا اور تندرست ہیں اور جب ان کا ملک آزاد تھا تو موسم گرما اکثر جنوبی فرانس میں گزارتے ٹینس کے بڑے کھلاڑی ہیں اور باوجود بادشاہ ہونیکے ان میں شمہ برابر بھی تصنع یا بناوٹ نہیں ہے' چنانچہ جنوبی فرانس کے مشہور شہر نیس میں جس پر آج اٹلی کا دانت ہے' ان کا ایک مکان ہے اور اس میں ایک معمولی شہری کی حیثیت سے موسم سرما گزارا کرتے تھے۔ لیکن حیثیت معمولی ہو' ذاتی شخصیت معمولی نہیں ہے اس لئے کہ دنیا کے حکمرانوں میں سب سے طویل القامت شخص ہیں اور کسی بھیڑ میں ہوں تو دوسروں سے ایک فٹ ڈیڑھ فٹ لمبے نظر آتے ہیں اس لئے کہ ان کی قامت سات فٹ سے بھی زیادہ ہے۔ کوئی باہر والا ڈنمارک جاکر کسی سے بادشاہ کا حلیہ پوچھے تو بس یہ جواب مل جائے گا کہ حلیہ کیا پوچھتے ہیں' ہمارے ملک میں جو سب سے لمبا شخص نظر آئے وہی ہمارا بادشاہ ہے!

جرمنی کے قبضے سے پہلے اس ملک میں عمومی طرز کی مکمل حکومت کا دوردورہ تھا۔ ۲۵ سال ہر مرد اور ہر عورت کو پارلیمنٹ کے انتخابات میں رائے دینے کا اختیار تھا اور سینتیس لاکھ کے اس چھوٹے سے ملک کے دارالعوام میں ڈیڑھ سو ارکان تھے جن کے انتخاب میں بطور خاص یہ اصول ملحوظ رکھا جاتا تھا کہ چھوٹی سے چھوٹی قلیت والے بھی نیابت اور رکنیت سے محروم نہ رہیں' چنانچہ ڈیڑھ سو میں سے ۱۱۷ ارکان کے انتخاب کے بعد جو اقلیتوں کے تناسب کے اصول پر ہوتا تھا' اگر یہ محسوس ہوتا کہ کسی خاص اقلیت کی نیابت باوجود تمام کوششوں کے نہیں ہوتی تو باقی نشستیں ایسی اقلیتوں کے درمیان تقسیم کردی جاتی تھیں۔ اس انتہائی عمومیت والے ایوان کا

توازن ایوان بالائی سے کیا جاتا تھا تاکہ جلد بازی یا کسی فوری جوش میں آکر ایسے قوانین منظور نہ ہو جائیں جو آگے چل کر ملک کے لئے نقصان رساں ثابت ہوں اور یہ ایوان ذرا زیادہ قدامت لئے ہوئے تھا۔ اس کے ۷۶ ارکان میں سے ۱۹ تو سابق ایوان منتخب کرتا تھا اور باقی ۵۷ دوہرے انتخاب کے طریقے پر منتخب ہوتے تھے یعنی پہلے انتخاب کنندے منتخب کئے جاتے تھے اور یہ انتخاب کنندے ارکان کا انتخاب کرتے تھے۔ اس ایوان میں بھی یہ لحاظ رکھا جاتا تھا کہ ملک کی اکثریت اور اقلیتوں کا پرتو۔ ایوان میں نظر آئے۔

ڈنمارک کی حال کی مصیبت سے پہلے اس کا دو عظیم الشان جزائر پر اثر تھا۔ ایک تو آئس لینڈ (برفستان) پر اور دوسرے گرین لینڈ (سبزستان) پر۔ آئس لینڈ سے اس کا تعلق مساویانہ تھا اس لئے کہ ۱۹۱۸ء میں دونوں کے درمیان ایک عہد نامہ ہوا جس کے بموجب ڈنمارک نے آئس لینڈ کی آزادی کو تسلیم کر لیا اور آئس لینڈ نے ڈنمارک کے بادشاہ کو اپنا بادشاہ مان کر بعض امور مثلاً خارجی معاملات، مدافعت وغیرہ ڈنمارک کے تفویض کردئے خود آئس لینڈ کی اپنی پارلیمنٹ، اپنا سکہ، اپنی وزارت تھی، لیکن شاید دنیا میں یہ ہی ایک ملک ہوگا جس کے پاس نہ کوئی فوج تھی نہ بیڑا نہ قلعہ نہ ہتھیار اور یہ اس لئے کہ آئس لینڈ کو معلوم تھا کہ کسی بڑے ملک کے سامنے اسے سرنگوں ہونا پڑے گا خواہ وہ کتنی ہی تیاری کیوں نہ کرے۔ دوسرا جزیرہ، جو رقبے کے اعتبار سے دنیا کے عظیم ترین جزیروں میں سے ہے، گرین لینڈ ہے۔ اس کا رقبہ سوا سات لاکھ مربع میل ہے لیکن اس میں سے سات لاکھ مربع میل بارھویں مہینے برف سے ڈھکا رہتا ہے

اور معلوم ہوتا ہے کہ کسی شوخ مزاج نے "برعکس نہند نام زنگی کافور" کے اصول پہ اس برف سے ڈھکے ہوئے جزیرے کا نام "سبزستان" رکھا ہوگا۔ آبادی صرف ۱۶ ہزار ہے جس میں سے پانچ سو ڈنمارکی اور باقی ایسکیمو ہیں۔ گرین لینڈ اور آئس لینڈ دونوں میں زیادہ تر ماہی گری اور سرد ملکوں کے روئیں دار جانوروں کی کھالوں کی تجارت ہوتی ہے اور گرین لینڈ میں وھیلیں پکڑی جاتی ہیں اور ان کے تیل، چمڑے اور دوسری پیداوار کی برآمد کی جاتی ہے۔

بیچارہ ڈنمارک نہ کسی کے اچھے میں تھا نہ کسی کے برے میں کہ ایک دن کسی بہانے کے بغیر یکایک جرمن فوجوں نے تمام ملک پر قبضہ کر لیا اور اس امن پسند قوم کو اپنے حلقہ غلامی میں لے لیا۔ اُدھر اس خیال سے کہ کہیں جرمنی آئس لینڈ پر قبضہ کر کے اس جزیرے کو کناڈا پہ حملہ کرنے کا مرکز نہ بنا لے، انگریزوں نے آگے بڑھ کر قبضہ کر لیا۔ رہے گرین لینڈ والے، تو وہ اطمینان سے وھیلیں پکڑنے اور انھیں ہلاک کرنے کے دلچسپ مشغلے میں لگے ہوئے ہیں۔ آگے کیا ہوگا اس کی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔

"رنگ لاتی ہے حنا پتھر سے پس جانے کے بعد"

اسی طرح جب ترکی کا جسم خاک میں مل چکا تھا جب اس کا جامہ تار تار ہو چکا تھا اس وقت

"مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"

کے مصداق دو شخص کمال اور عصمت اٹھے۔ اور انھوں نے کیا کا کیا کر دیا۔ ۱۶ مئی ۱۹۱۹ء کو جنرل مصطفےٰ کمال پاشا نے قسطنطنیہ کے وزیر جنگ سے یہ کہکر کہ جنگ تو ختم ہو ہی چکی، اب فوج برخواست ہو جانی چاہیئے، اپنے آپ کو اس برخواستگی کی نگرانی کے لئے خود قسطنطنیہ کے اتحادی کمانڈر کی اجازت سے مقرر کرالیا اور سیدھے سیواس جا کر اتحادیوں کے علی الرغم پسی ہوئی ترکی میں سے وہ جوہر پیدا کئے جو آج تک کام کر رہے ہیں۔

موجودہ آزاد ترکی کی ابتدا عہدنامہ لوزان سے ہوتی ہے جس کے ذریعے یورپ میں ترکی کو اڈریا نوپل یا ادرنہ مل گیا، قسطنطنیہ یا استنبول سے یونانی اور اتحادی فوجیں ہٹائی گئیں اور تقریباً تمام ترکی وطن جمہوریہ ترکیہ کے ماتحت آگیا لیکن ترکی کے جسم میں ابھی دو کانٹے اور باقی تھے۔ ایک تو یہ کہ اس کی رو سے خاص استنبول کے علاقے اور درۂ دانیال کو غیر مسلح کر دیا گیا تھا اور دوسرے ولایت اسکندرون جس میں انطاکیہ شامل تھا اور جہاں کی اکثریت ترکی تھی، وہ بھی فرانس کے مفوضہ علاقہ شام میں شامل کر دیا گیا تھا۔ لیکن شاید پہلے ہی دن سے مصطفےٰ کمال اور ان کے ہم خیال اس سوچ میں تھے کہ یہ کانٹے کیسے نکالے جائیں جب اٹلی نے حبش کو زیر کیا اور یورپی مملکتیں بجائے بے اسلحگی کی حکمت عملی کے روز بروز اپنے ہتھیار دیں

اضافہ کرنے لگیں تو ترکی نے بجائے اس کے کہ وہ ہٹلر کی طرح پرانے عہدناموں کو پھاڑ کر پھینک دیتا، ایک یادداشت بھیجی کہ چونکہ صورت حال اب بدل گئی ہے اس لئے ہمیں اجازت ملنی چاہیئے کہ ہم خود اپنے وطن کے ایک اہم حصے یعنی درۂ دانیال اور باسفورس کو مسلح کر سکیں۔ مونترو کی کانفرنس میں جس میں جرمنی اور اٹلی کے سوا یورپ کی بہت سی سلطنتیں اور جاپان شریک تھے، ترکی کو اس کی اجازت مل گئی۔ رہا اسکندرون کا مسئلہ تو یہ اس وقت اٹھایا گیا جب عراق کے برطانوی حکمبرداری سے آزادی کے بعد فرانس نے اعلان کیا کہ وہ بھی ایسے ہی شرائط کے ساتھ شام کو آزادی دینا چاہتا ہے۔ اس پر ترکی کی طرف سے یہ سوال پیدا ہوا کہ جب اسکندرون ترکی سے جدا کیا گیا تھا تو اس وقت فریق فرانس اور ترکی تھے نہ کہ شام اور ترکی اور اب جبکہ فرانس شام کو آزادی دینا چاہتا ہے تو اس کی ضرورت ہے کہ اسکندرون کو بھی آزادی دے دی جائے چنانچہ پہلے تو اسکندرون کی ایک آزاد ریاست فرانس کے زیر حمایت بنائی گئی پھر اس کے امن و امان کا فرانس اور ترکی دونوں کو ذمہ دار قرار دیا گیا اور حالیہ جنگ کی ابتداء میں فرانس نے ترکی سے ایک عہدنامہ کر کے یہ نزاعی ولایت آخرکار ترکی کے سپرد کر دی۔

یہ تو ترکی کی مجمل سیاسی تاریخ ہوئی۔ لیکن اس احیاء کے اندر بے شمار عناصر مضمر ہیں جن کی وجہ سے مظفر و منصور دول یورپ کے مقابلے میں وہ نہ صرف اپنے بچے کھچے رقبہ کو دوگنا کرنے کے قابل ہو گیا ہے بلکہ آل عثمان کے آخری تاجداروں کے زمانے میں مراعات کے نام سے جو طرح طرح کی تحدیدیں عائد کی گئی تھیں ان سب سے

آزاد ہوگیا ہے یہی نہیں بلکہ وہ اتنا طاقتور ہوگیا ہے کہ موجودہ جنگ میں اس نے اپنا سیاسی پلڑا قطعی طور پر انگلستان اور عمومیت کی طرف جھکا کر فلسطین، سوئیس اور مصر کی طرف ہٹلر کا راستہ روک دیا ہے، جس کی اہمیت کا انگلستان اور جرمنی دونوں کو پوری طرح سے اندازہ ہے۔ غرض ہمیں اس تھوڑے سے وقت میں جو ہمیں دیا گیا ہے ان اسباب میں سے سب نہیں تو چند ہی اسباب تلاش کرنے ہوں گے جن کی وجہ سے ترکی نے از سر نو دول یورپ کی پہلی صف میں جگہ پالی ہے۔

سب سے پہلے تو تعلیم کو لیجیے، جس کی طرف معاشری اصلاحات کے ساتھ ساتھ ترکی نے اپنی پوری توجہ مبذول کی اور جس کی وجہ سے دس سال کے قلیل عرصے میں مدرسوں کو جانے والے طلبہ کی تعداد دوگنی اور طالبات کی تعداد پچ گنی ہوگئی۔ تعلیم کی طرف ترکوں کا اتنا رجحان ہے کہ شائد سب سے متمدن ملکوں میں بھی اس سے زیادہ مشکل سے ہوگا۔ میں خود جب ۱۹۳۰ء کے وسط میں استنبول گیا تھا تو جامعۂ استنبول تعطیلات گرما کی وجہ سے بند تھا۔ میں صبح شام جامعہ کے کتب خانے جاکر اپنے مضمون کی بعض نایاب کتابوں مطالعہ کیا کرتا تھا۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ جامعہ کا مطالعہ خانہ طلبا اور طالبات سے بھرا ہوا ہوتا تھا اور ایک بجے تک مشکل سے کوئی ایسا مطالعہ کرنے والا ہوگا جو اپنے کام میں مستغرق نہ ہو۔ اس سے چند ہی سال پہلے ترکی زبان کے لئے لاطینی رسم خط تجویز ہوا تھا اور ہر فرد مرد ہو یا عورت اس کوشش میں مشغول تھا کہ جتنے جواہر ریزے ترکی زبان میں ہیں یا جتنی کتابیں ترکوں نے فارسی یا عربی میں لکھی ہیں ان سب کو "ینی ترکچہ" یعنی نئی ترکی رسم الخط میں ڈھال لیا جائے۔ یہ کچھ عجیب معلوم ہوتا تھا کہ یوروپی قماش کے لڑکے لڑکیاں،

سنہرے بال اور نیلی یا ہلکی بھوری آنکھیں، ٹھیٹ پوری کپڑے پہنے ہوئے، ترکی فارسی پڑھنے میں مستغرق نظر آتے ہیں اور سب کے پیش نظر صرف ایک ہی مقصد ہے وہ یہ کہ اپنی زبان کو پہلے سے بھی زیادہ درخشاں بنایا جائے۔

مدرسوں اور جامعہ سے بھی زیادہ تعلیم کی ترویج کے لئے ایک نہایت مؤثر طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور یہ "خلق ایوی" یا تعلیم گھروں کا ہے ان تعلیم گھروں کی ابتدا سنہ ۱۹۳۱ء میں ہوئی اور یہ در اصل عمومی کلب ہیں جو ملک کے ہر گوشے میں کھولدئے گئے ہیں۔ اس وقت ان کی تعداد کم و بیش ۳۰۰ ہے اور ہر کلب میں فنون لطیفہ جسمانی ورزش، معاشری امداد، کتب خانے، نوادر خانے، ان شعبوں میں سے ایک یا ایک سے زائد ہوتے ہیں اس کی افادیت اور ہردلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ سنہ ۱۹۳۷ء میں ان کے کتب خانوں میں ڈیڑھ لاکھ کے قریب کتابیں تک تھیں اور پندرہ لاکھ ترک ان سے مستفید ہوئے تھے۔ ان تعلیم گھروں کا اصول ایک فقرے میں مرکوز ہے کہ ملک کی فطری قوت کا سب سے بڑا اور سب سے قیمتی خزانہ عوام الناس ہیں اور حکومت کا فرض ہے کہ انھیں اعلیٰ ترین معلومات سے مالا مال کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے عہدے دار بڑے بڑے پروفیسر اور فاضل اجل علما یہاں تک کہ خود صدر جمہوریہ ترکیہ ان تعلیم گھروں میں لکچر دینے کے کام میں مسابقت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

اتاترک مرحوم نے بطور خاص تاریخ کی تحقیقات اور اس کی ترویج پر زور دیا اور شائد کسی غیر سیاسی انجمن کے قیام اور استحکام کے لئے اس سے زیادہ کوشش نہ کی گئی ہوگی جتنی انجمن تاریخ ترکیہ کے لئے۔ پہلی تاریخی کانگرس سنہ ۱۹۳۲ء میں منعقد

ہوئی جس میں خود اتاترک مرحوم نے نہایت نمایاں حصہ لیا۔ جب ان کا انتقال ہوا ہے تو انھوں نے اپنا جملہ اثاثہ انجمن تاریخ ترکیہ کے لئے چھوڑ دیا۔

اب صنعت و حرفت کو لیجئے۔ ۱۹۲۳ء کا زمانہ ترکی کی تاریخ میں ایک نہایت تاریک زمانہ تھا۔ محبان وطن ملک کے دشمنوں سے لڑ رہے تھے اور ملک کے لئے زندگی اور موت کی کشمکش جاری تھی۔ لیکن اس وقت بھی ان کی نگاہ ملک کی مرفہ الحالی پر لگی ہوئی تھی اور جو بھی تھوڑا بہت سرمایہ پاس تھا اس کا ایک بڑا حصہ ریلوں کی تعمیر پر صرف کیا جا رہا تھا۔ انقلابی حکومت نے ملک کی صنعت کو ترقی دینے کے لئے باہر کی کلوں کو بلا محصول ملک میں آنے کی اجازت دے دی اور تمباکو، دیا سلائی اور الکوہل سازی کے اجارے اپنے قبضے میں کر لئے۔ ۱۹۳۴ء میں پانچ پانچ سال کے معاشی پلین کا آغاز ہوا۔ قرار پایا کہ پہلے پانچ سال میں ایسا انتظام کیا جائے کہ ملک معمولی اشیا کے لئے بیرونی ممالک کا محتاج نہ رہے، چنانچہ کپڑا بننے، شیشہ سازی، ریشم، دباغت اور سیمنٹ کے کارخانے قائم کئے گئے اور ساتھ ہی یہ شرط لگا دی گئی کہ گو وقتی طور پر روسی، جرمن اور انگریز مبصران میں کام کر سکتے ہیں لیکن سرمایہ ترکی ہی ہوگا۔ اس غرض سے پندرہ کروڑ روپے کے سرمائے سے دو بنکیں بطور خاص قائم کی گئیں اور ان کی شاخیں ملک میں پھیلا دی گئیں۔ دوسرے پنج سالہ معاشی نقشے کا مقصد برقی قوت مہیا کرنا اور زراعت کان کنی اور لوہے کے مصنوعات کو فروغ دینا ہے۔ تیسری چار سالہ پلین جو امسال شروع ہونے والی تھی اس کا مقصد یہ ہوگا کہ زراعت کو جدید ترین ایجادوں سے مالا مال کیا جائے، آب رسانی کا پورا انتظام کیا جائے، اور ملک کے چاروں طرف درخت نصب کئے جائیں

اس تمام دوران میں باوجود کثیر اخراجات کے ریل کا جال بچھانے کی خاص طور پر کوشش کی گئی ہے، چنانچہ جہاں سنہ ۱۹۲۳ء میں تمام ملک میں صرف ۵۵۸ میل ریل تھی سنہ ۱۹۳۷ء کے ابتدا میں اس کی لمبائی چار ہزار میل کے قریب تک پہونچ گئی تھی
نئے انتظامات کا بڑا سخت امتحان پہلے نومبر سنہ ۱۹۳۸ء میں اتاترک کے انتقال پر اور پھر دسمبر سنہ ۱۹۳۹ء میں اس عظیم الشان زلزلے کی صورت میں ہوا جس نے ترکی زمین ہی کو نہیں بلکہ تمام جدید ترکی معاشرت اس کی مالیات اور اس کی سیاست کو ہلا ڈالا۔ لیکن جدید ترکی کی بنیادیں ایسی مضبوط تھیں کہ ایوان کو جنبش ضرور ہوئی لیکن وہ اپنی جگہ پر جما رہا۔ نئے صدر عصمت انونو نے ان زخموں کو مندمل کرنے میں جس عظیم الشان استقلال کا ثبوت دیا ہے اس سے ہم سب واقف ہیں۔ کمال نے میدان جنگ میں اپنے ملک کے دشمنوں کو نیچا دکھا کر ترکی کا بول بالا کیا اور میثاق سعد آباد اور ایتلاف بلقان سے اپنے دائیں اور بائیں بازو طاقتور کر لئے، اب عصمت نے آگے بڑھ کر ترکی اور یورپ کی سب سے بڑی طاقت برطانیہ کے ساتھ جو تعلقات پہلے سے تھے ان کو اور بھی زیادہ مستحکم کر دیا ہے اور یہ ایک طرف ہٹلر کو مشرق کے اقدام سے روکے ہوئے ہے اور دوسری جانب ترکی کی آزادی کی بھی کافی ضمانت ہے۔

عربوں کا تمدّن

(۳ / اپریل ۱۹۴۱ء)

اگر آپ مئی کے مہینے میں جب گرمی کی شدت سے چیل انڈا چھوڑتی ہو کسی زرخیز سے زرخیز میدان میں جائیں تو باوجود عمدہ زمین ہونے کے آپ کو کوئی پھل پھول یا سبزہ نظر نہ آئے گا۔ جگہ جگہ کانٹوں دار درخت جیسے ببول، بیری، پتھر چٹے ضرور دکھائی دیں گے، لیکن ان میں شجریت کم اور کانٹے زیادہ ہوں گے۔ اب ذرا چند روز ٹھہر کر اگست ستمبر میں اسی میدان کو دیکھنے جائیے۔ خدا کی رحمت نازل ہو چکی ہے، زمین کو ایک نئی زندگی مل چکی ہے، جہاں خس و خاشاک کے سوا کچھ نہ تھا وہاں مسکراتے ہوئے کاشتکار، لہلہاتے ہوئے کھیت، سبزہ ہی سبزہ نظر آ رہا ہوگا اور یہ پہچاننا مشکل ہوگا کہ یہ وہی چٹیل میدان ہے جسے آپ نے چند ہفتے پہلے دیکھا تھا۔ یہی کیفیت بعض ملکوں کی ہوتی ہے۔ خدا نے ہر انسان اور ہر قوم کو ترقی کرنے کی قابلیت ودیعت کی ہے لیکن اس کے لئے ضرورت ہے کہ کوئی نہ کوئی زبردست محرک ہو جو اس قابلیت کو ابھارے اور اس کے ذریعہ سے

اس ملک کی خصوصاً، بنی نوع آدم کی عموماً، خدمت کرنے کی اہلیت پیدا کرے
اس محرک کی کار فرمائی سے پہلے قابلیت اور اہلیت ضرور تھی لیکن چھپی ہوئی تھی
اور اب وہ ظاہر ہو کر اپنی بساط کے موافق ملک کی کارکردگی اور افادیت میں
ایک تغیر پیدا کر دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تغیر کا معیار محرک کی قوت پر ہوگا۔
اگر یہ کمزور ہے تو اثرات بھی کمزور ہوں گے اور اگر اس میں شدت ہے تو یہ
اسی ملک میں جو پہلے بے جان لاشہ کی طرح پڑا تھا اب ایک خاص امتیاز اور
کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب ہوگا۔

ملک عرب کی تمدنی تاریخ بھی اسی طرح دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے،
ایک تو اسلام سے پہلے اور دوسرے اسلام کے بعد۔ یہ مسئلہ نہایت غور کا محتاج
ہے کہ کسی طرح ایسی قوم کی چشم زدن میں کایا پلٹ ہوگئی جو ابتدائے آفرینش سے
کس مپرسی کے عالم میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ کسی دوسری قوم سے ربط ضبط قائم
کرنا ضروری سمجھتی تھی نہ کسی دوسری قوم کو اس سے کوئی زیادہ واسطہ تھا۔ ایران،
عراق، یونان، روما سب ہی کے کارنامے دنیا نے دیکھے؛ سکندر بھی آیا چلا گیا؛
قیاصرہ روما نے دور دراز کے ملک فتح کیے؛ بودھ مت کی رو ایشیائے کوچک اور
مقدونیہ تک پہنچ گئی؛ لیکن شاید عرب کے بے آب و گیاہ لق و دق صحرا سے
یہ سب مرعوب ہوگئے یا اس طرف نظر ڈالنا بیکار سمجھا۔

بلاشبہ کسی ایسی زمین کی طرح جو زرخیز تو ہو لیکن باران رحمت نہ برسا
ہو اس سرزمین کے باشندوں میں بھی بہت سی ایسی خصوصیتیں تھیں جن پر اسلام
جیسے محرک کے آتے ہی جلا ہوگئی۔ ان کی مہمان نوازی، وفائے عہد، بہادری، سردا

قبیلہ کی عزّت کرنا، یہ سب خصوصیتیں خاص طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ان کی معاشرت میں سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ وہ اپنے قبیلے اور اپنے حسب نسب کے اتنے دلدادہ تھے کہ کسی بستی یا کسی شخصیت کو اپنا مرکز تصور نہیں کرتے تھے اور جو نیم متمدن ریاستیں تھیں وہ کسی غیر عرب فاتح کی فتوحات کا باقی نہیں۔ حسب نسب اور شرافت و نجابت کے مبالغہ آمیز تخیل نے کچھ ایسا گھر کر لیا تھا کہ بعض قبیلوں میں لڑکی کا پیدا ہونا ایک مصیبت عظیم سمجھا جاتا تھا۔ خودداری کے غلط معنے سمجھے گئے تھے اور یک جہتی نہ ہونے کی وجہ سے ذرا ذرا سی بات پر تلوار چل جاتی تھی اور یہ جھگڑا کئی کئی سال تک رہتا تھا۔ ان کا مذہب بھی اسی قبیلہ داری نظم پر مبنی تھا، اور بت پرستی اتنی بڑھ گئی تھی کہ خود خانہ کعبہ میں بجائے ایک خدا کے ۳۶۰ بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ پھر یہ بھی نہیں کہ ہر بت کے ساتھ کوئی خصوصیت وابستہ ہو بلکہ ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ کوئی بڑا آدمی یمن شام یا عراق گیا وہاں دیکھا کہ ایک خوبصورت بت پوجا جا رہا ہے بس واپس آکر اپنے قبیلے میں بے سوچے سمجھے ایسا ہی بت بنایا اور پوجا شروع کر دی۔ سفر میں پتھر کی مورت نہ ملی تو ریت کا (جس کی عرب میں کوئی کمی نہ تھی) ایک تودا بنایا اس پہ اونٹنی کے دودھ کا چھڑکاؤ کیا اور لگے اس کے سامنے سجدے کرنے۔ شراب اور جوئے سے عرب لوگوں کو خاص انس تھا اور جس کے پاس جوئے کے لئے پیسے نہ ہوتے وہ ڈاکہ ڈالتا اور اس میں لگاتا۔

ظاہر ہے کہ ایسی قوم میں علم و فن کا کہاں پتہ ہوگا۔ لکھنا پڑھنا شاذ تھا یمن میں پھر بھی حبشہ کے قرب کی وجہ سے تھوڑی بہت خطاطی کا رواج تھا لیکن

شیوع اسلام کے وقت تمام ملک حجاز میں صرف ۱۷ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور قوم کی قوم امی یا ان پڑھ ہونا اپنا فخر سمجھتی تھی۔ شعر گوئی میں عرب یکتا تھے اور مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی شعر کہتی تھیں، لیکن یہ اشعار اس قدر فحش اور ہزلیات سے بھرے ہوتے تھے کہ آج کے گئے گذرے زمانہ میں بھی یہ کسی ثقہ محفل میں نہیں پڑھے جا سکتے۔

غرض بہت سے نقائص کے ساتھ ساتھ عربوں میں ایسی صفات بھی تھیں جیسے بہادری، قبیلے کے ساتھ محبت، مہمان نوازی اور عصبیت، جن سے پورے طور سے کام نہیں لیا گیا تھا اور سوائے حضرت ابراہیمؑ کے جنھوں نے عربوں میں ایکا کرنے کی کوشش کی تھی کوئی دوسرا ایسا محرک پیدا نہیں ہوا تھا جو ان چھپے ہوئے جوہروں پر صیقل کرے، ایسی صیقل کہ عرب جاہل وحشی درندے دنیا کے معلم بن جائیں اور بیشتر آبادی، عالم کو اپنے رنگ میں رنگ دیں۔

اسلام نے عرب کی کایا پلٹ دی۔ کسی ملک یا قوم کی ترقی کے لئے سب سے اہم چیز نظم و ضبط ہے اور یہ بغیر کسی مرکز کے ناممکن ہے۔ لیکن نظم و ضبط سے یہ مراد نہیں کہ انسان کی خودی کو مار دیا جائے بلکہ صحیح نظم وہی ہے جس میں انسان کی آزادی بھی برقرار رہے۔ اس محرک نے جسے اسلام کہتے ہیں ایک طرف تو عربوں کو سکھایا کہ تم میں وحدت یکانگت اور ایکا ہونا چاہئے اور تم آپس میں بھائی بھائی ہو، اور ساتھ ہی سب کو بڑے بڑے شیوخ اور ساہوکاروں سے لے کر غلاموں تک کو، سکھایا کہ تم سب صرف ایک خدا کے بندے ہونے کی وجہ سے آپس میں برابر ہو اور کسی کو کسی دوسرے پر تفوق حاصل نہیں۔ اس انتہائی پابندی اور انتہائی

آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب قوم میں ایک عظیم الشان حرکت پیدا ہوئی اور پہلے تو صرف ملک عرب یک جان ہو کر متحد ہوا، پھر اس نے تہذیب و تمدن کے ان انوکھے خیالات کو اپنا بنا کر انہیں چار دانگ عالم میں پھیلا دیا۔

یہ ایک عجیب و غریب واقعہ ہے جس کی تاریخ میں مشکل سے کوئی مثال مل سکتی ہے کہ وہی عرب جن میں کسی زمانہ میں صرف ۱۷ آدمی تھوڑا بہت پڑھنا جانتے تھے انھوں نے اپنے علوم و فنون کا ایسا سکہ جمایا کہ ہندوستان سے لے کر اسپین تک کے تمام ملکوں کی مادری زبان عربی ہو گئی، ورنہ رسم الخط تو ضرور ہی عربی ہو گیا، اور اس زبان کے سانچے سے دنیا بھر کے علم و فن ڈھل کر نکلنے لگے۔ ایک عربی فلسفی بو علی سینا کا پایہ ارسطو کے بعد ہی سمجھا جاتا ہے۔ حدیث کے ذریعہ سے علم اسناد کو ایسا کمال کو پہنچایا کہ اس سے تاریخی استناد کا معیار قائم ہوا۔ پھر ریاضی، ہندسہ، مناظریات، ہیئت، کیمیا، طبیعات، جیسے علوم کے ساتھ ایسے کارآمد فنون جیسے پارچہ بافی، جہاز سازی، اسلحہ سازی، زراعت، طب، جراحی غرض کونسا ایسا علم یا فن ہے جس میں وہ بام ترقی پر نہیں پہنچے۔ عربی زبان کی بال کی کھال نکالی۔ ادب، صرف و نحو، کلام بلاغت، عروض، تجوید، تشریح، تفسیر ان سب میں ایجادات کیں اور اس طرح دوسری زبانوں کے لئے راستہ صاف کیا۔ عربی زبان ایک ترنم آفرین زبان ہے چنانچہ انھوں نے اس خصوصیت کو بھی آگے بڑھایا اور اس قوم میں ایسے ایسے موسیقی دان اور مطرب پیدا ہوئے کہ جن پر دنیا فخر کر سکتی ہے۔

میدان جنگ میں بھی عربوں نے اپنے تمدن اور اپنے مسلک کی حفاظت

کے لئے کیا کیا جان توڑ کوششیں کی ہیں۔ انہی آبا و اجداد کے جانشین جو اونٹنیوں کی
خاطر بیسیوں برس تک اپنے بھائیوں کا خون بہانے میں گریز نہ کرتے تھے، شیر و شکر
کی طرح آپس میں مل گئے اور ایک ہو کر ہندوستان کے دریائے سندھ سے فرانس
کے دریائے رھون اور سوئستان تک تمام عالم زیر کر لیا۔ وہ جسمانی اعتبار سے
ہی فاتح نہیں بلکہ انھوں نے قوموں کے دل بھی فتح کر لئے اور انھیں عجمی سے عرب
بنا دیا۔ ایسے ایسے ائمہ اور علماء جن کے نام لینے سے آج کروڑوں کے منھ سوکھتے
ہیں جیسے امام بخاری، امام غزالی، امام ابو حنیفہ، امام رازی، ابن رشد، ابن خورداذبہ
اور سینکڑوں دوسرے ایسے تھے جو عرب تو نہ تھے لیکن عربی چولہ ایسا پہنا تھا کہ
کوئی شخص ان کی تصانیف دیکھ کر یہ نہیں بتلا سکتا کہ یہ عجمی ہوں گے۔ عربیت
اقصائے عالم پر اس طرح چھا گئی تھی کہ جب یہ قوم اسپین سے بصد اذیت نکالی
گئی ہے تو مدت تک اس جزیرہ نما کے عیسائی اپنی نماز عربی ہی میں پڑھتے رہے
یہ نفوذ بزور شمشیر نہیں ہوا تھا بلکہ عربی تمدن نے دوسروں کے دل موہ لئے تھے
اور آج بھی یوروپی جامعات کا علمی لباس تقریباً خالص عربی چغہ ہے۔

قوانین جنگ کے سلسلے میں، جو آج کل کس بے دردی سے توڑے جاتے
ہیں، یہ خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شاید دنیا میں عرب ہی پہلی قوم ہے
جس نے جنگی قیدیوں کے ساتھ انسانیت کا سلوک روا رکھا اور محض پڑھنا
سکھانے پر انھیں رہا کرنا جائز تصور کیا۔ پھر جس چیز سے آج بھی ہماری بہت سی
مشرقی بہنیں جھجھکتی ہیں اور جو یورپ میں گھر گھر عام ہو گئی ہے، یعنی بیماروں کی مرہم
پٹی اور نرسنگ، اس کی پہل کا سہرا بھی عربوں ہی کے سر ہے۔ بدر اور احد کے

میدانوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ بڑی بڑی شریف عرب خواتین میں سے کوئی مشکیزہ لئے زخمیوں کو پانی پلا رہی ہے، کوئی مرہم پٹی کر رہی ہے کوئی کسی زخمی کو اپنی پیٹھ پر لاد کر کسی محفوظ مقام کو لے جا رہی ہے۔ اس میں بہت کم شبہ ہے کہ انیسویں صدی عیسوی میں جنگ کریمیہ کے موقع پر فلورنس نائٹ انگیل Florence Nightingale نے اپنے ہم قوموں کو جو نرسنگ سکھائی تھی اس کا درس اسے اسی عربی تمدن کے جان نثاروں یعنی عثمانی ترکوں نے دیا ہوگا۔

باوجود ایسی درخشاں تاریخ کے جو کسی قوم کے لئے بھی تفاخر کا باعث ہو سکتی ہے آج بھی عربوں میں لطف و کرم مہمان نوازی اور سادگی بدرجہ اتم نمایاں ہے۔ دو تین آپ بیتی قصے بیان کروں گا۔ ۱۹۲۵ء میں مجھے حج بیت اللہ شریف کی سعادت حاصل ہوئی اور اس سفر میں عربی کردار کی عجیب و غریب مثالیں دیکھنے میں آئیں۔ ابھی بمبئی میں جہاز پر سوار ہی ہوا تھا کہ سلطان ابن سعود کے سفیر شیخ ابراہیم الفضل نے (جنہیں پہلے سے اچھی طرح جانتا تھا) مجھے بلایا اور کہا کہ میں آپ کو ایک خاص صاحب سے ملانا چاہتا ہوں جو سلطان کے مقرب ہیں اور جو بحرین، پیرس اور بمبئی میں موتیوں کی تجارت کرتے ہیں۔ ان کا نام شیخ القصیبی تھا۔ خیر یہ بات آئی گئی ہو گی میں اپنے کمرے میں سامان کو ترتیب دینے میں مشغول تھا کہ یکایک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کھولا تو دیکھا کہ قصیبی صاحب کے معتمد کھڑے ہیں۔ مجھ سے کہا کہ شیخ نے آپ کو سلام کے بعد کہا ہے کہ بحری سفر کے دوران میں آپ اور آپ کے ساتھ والے سب شیخ کے مہمان ہیں میں نے اُسے

محض ایک رسمی بات سمجھ کر معافی چاہی اور کہلوایا کہ ہم آپ دونوں مسافر ہیں میزبانی اور مہمانی کی کیا ضرورت ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد عرشے پر جو گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شیخ ابراہیم الفضل نہایت پریشان میری طرف آرہے ہیں۔ ملتے ہی کہنے لگے کہ آپ نے کیا غضب کیا کہ ایک عرب کی دعوت کو رد کر دیا۔ سمجھ لیجیئے کہ اگر ان کی دعوت قبول نہ کی تو حجاز میں خدانخواستہ آپ کو بڑی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑے گا اس واسطے کہ کسی عرب کے لئے اس سے زیادہ کوئی بات توہین آمیز نہیں ہوسکتی کہ اس کی دعوت کو رد کیا جائے۔ غرض یہ کہ طوعاً وکرہاً دعوت قبول کرنی ہی پڑی۔ میری اور قصیبی صاحب کی بڑی دوستی ہوگئی اور ان کی وجہ سے حجاز میں بہت آرام ملا۔

معاملہ فہمی اور سادگی کی بھی مثال سن لیجیئے۔ مدینۂ طیبہ میں کسی کام کو وہاں کے صدر مہتمم پولیس مہدی بے کے پاس جانے کا اتفاق ہوا۔ ان کے پاس آدھے گھنٹے کے اندر تین چار چھوٹے چھوٹے مقدمے آئے، تصفیئے ہوئے ڈگریاں گویا جاری ہوئیں، اور وہیں کی وہیں چکادی گئیں۔ طائف کے جج شیخ احمد ابن علی النجار جن کے یہاں میں نے دو روز قیام کیا تھا، فرماتے تھے کہ فوجداری مقدمہ کا دوران زیادہ سے زیادہ چار روز اور دیوانی مقدمہ کا دوران زیادہ سے زیادہ دس روز ہے، اور اس مدت میں شہادت، تجویز، مرافعہ، ڈگری کا اجرا اداؔگی سب ہی کچھ ہوجاتا ہے۔ وکیل بیرسٹر مفقود ہیں اور میں نے دیکھا کہ امور شرعی کے استفسار کے لئے خود شیخ کے پاس لوگ آتے تھے اور انھیں بلا فیس کے مشورہ دیا جاتا تھا۔ امانت کی یہ کیفیت ہے کہ مکۂ معظمہ کے حرم شریف میں مغرب کی

اذان ہوئی اور دُکاندار، جن میں صراف بھی شامل تھے، اپنی اپنی دکانیں کھلی چھوڑ نماز کے لئے چلدئے اور آے تو ہر چیز جوں کی توں پائی۔ میں نے خاص طور پر صرافوں کا اس لئے ذکر کیا کہ چونکہ مکہ ایک طرح سے بین اقوامی شہر ہے اور اس میں ساتوں ولایت کے لوگ آتے ہیں اس لئے صرافے کا بیوپار نہایت عام ہے اور یہ دکانیں ملک ملک کے سونے، نوٹوں اور روپیے سے بھری ہوتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک عرب پر اس نام نہاد تہذیب کا پر تو ذرا کم پڑا ہے جس کے اثر سے آج کل انسان انسان کو درندوں کی طرح پھاڑ کھائے جاتا ہے۔ اور اس پر فخر کرتا ہے۔ عربوں نے ابھی تک اس معلم کی تعلیم نہیں بھولی ہے جس نے انھیں بنی نوع انسان کی ہمدردی کا سبق دیا تھا۔ مولانا حالی فرماتے ہیں

سکھائی انھیں نوع انسان کی شفقت — کہا ہے یہ اسلامیوں کی علامت
کہ ہمسایہ سے رکھتے ہیں وہ محبت — شب و روز پہنچاتے ہیں اس کو راحت
خدا رحم کرتا نہیں اس بشر پر — نہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر
کسی کے گر آفت گذر جائے سر پر — پڑے غم کا سایہ نہ اس بے اثر پر
کرو مہربانی تم اہل زمیں پر — خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

(۱۷ رجون سنہ ۱۹۴۱ء)

عمومیت یا Democracy ایک ایسا لفظ ہے جو مدت دراز سے لوگوں کی زبان پر ہے اور اسے بہت سی بیماریوں کا علاج سمجھا گیا ہے، لیکن اس کا مفہوم کماحقہٗ کبھی واضح نہیں ہوا۔ ہماری زبان کے بہت سے اخبارات اور رسائل نہایت آزادی کے ساتھ Democracy کا ترجمہ جمہوریت کرتے ہیں حالانکہ Republic یا جمہوریہ اور Democracy یا عمومیت میں ایک نوعی فرق ہے۔ Republic اس طرز حکومت کا نام ہے جس میں موروثی بادشاہ کے لئے کوئی جگہ نہو، جیسے فرانس، ممالک متحدہ امریکہ اور بیسیوں دوسرے ملک۔ ان ملکوں میں جو شخص مملکت کا سرگروہ ہوتا ہے وہ منتخب شدہ ہوتا ہے اور اپنی مدت عہدہ ختم کرنے کے بعد یا تو ہٹ کر دوسرے کے لئے جگہ چھوڑ دیتا ہے ورنہ دوسری مرتبہ اپنا انتخاب کرا لیتا ہے۔ مثال کی طور پر، ممالک متحدہ امریکہ اس لئے ایک جمہوریہ کہلائے گا کہ صدر روزویلٹ انتخاب کے حق سے،

نہ کہ میراث کے حق سے، سربراہ کار ہے؛ اسی طرح ہم چین کو بھی جمہوریہ کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ وہاں کے زعیم مارشل چیانگ کائی شک کا حق موروثی نہیں ہے۔ غرض محض بادشاہ نہ ہونے سے کوئی ملک جمہوریت بن جاتا ہے بلا لحاظ اس کے کہ اندرونی حکومت کا طرز کیا ہے، یعنی حکومت صرف چند اشخاص پر محدود ہے یا تمام قوم ملکر حکومت کرتی ہے یا ملک ایک خاص سیاسی گروہ کا آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ مثلاً باوجود جمہوریہ ہونے کے چین پر ایک شخص واحد کی حکومت ہے اور روس میں جس اصول کا حامل وہاں کا آمر اسٹالین ہے وہ جملہ آبادی کا زیادہ سے زیادہ ۵ فی صد آبادی پر مشتمل ہے۔

برخلاف اس کے عمومیت ایک مخصوص طرز حکومت کا نام، یعنی وہ طرز جس کے تحت حکومت کا کام عوام الناس یا ان کے قائم مقام چلاتے ہوں۔ ملوکیت اور جمہوریت دونوں میں اس طرز پر حکومت کی جا سکتی ہے۔ مثلاً انگلستان کو لیجئے، جسے بادشاہ کے ہونے کی وجہ سے جمہوریت تو کہا نہیں جا سکتا لیکن جو یقیناً ایک عمومیت ہے یعنی یہاں عموم اپنے قائم مقاموں کے ذریعے سے حکومت کرتے ہیں اور بادشاہ کو براہ راست کسی قسم کے واقعی اختیارات حاصل نہیں۔ بحر اوقیانوس کے دوسری طرف ممالک متحدہ امریکہ کا عمومی جمہوریہ ہے جہاں کی حکومت کا دارومدار بھی عموم پر ہی ہے گو یہاں کی عمومیت کی تشکیل انگلستان سے بالکل جداگانہ طرز پر ہوئی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصول عمومیت کا مظاہرہ مختلف ملکوں میں مختلف طریقوں سے ہوتا ہے۔ عمومیتوں میں حکومت کا دارومدار ضرور عموم پر ہوتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ

عموم کے اثر انداز ہونے کا طریقہ پہلے سے طے شدہ نہیں اور ہر ملک کی کیفیت جداگانہ ہوتی ہے۔ انیسویں صدی میں تمام یورپ میں لبرل خیالات کی ایک لہر دوڑ گئی تھی اور ان کا سب سے بڑا منبع انگلستان سمجھا جاتا تھا۔ اسی زمانہ میں قومیت کے اصول کی بھی ترویج ہوگی جس کا مظاہرہ جرمنی اور اٹلی کے اتحادوں اور سلطنت عثمانیہ کے انتشار کی صورت میں ہوا۔ بہت سے نئے ملک گویا پیدا ہوئے، اور چونکہ اس صدی میں سلطنت برطانیہ کو روز بروز عروج حاصل ہو رہا تھا اس لئے یہ خیال ہوا کہ تمام سیاسی آلام و امراض کے لئے اگر کوئی تریاق ہے تو بس یہی کہ انگلستان کے طرز کی دو ایوانی پارلیمنٹ بنائی جائے اور ایک بادشاہ مقرر کر لیا جائے، لیکن وہ ایسا ہو کہ اسے کسی طرح کا سیاسی اختیار حاصل نہ ہو؛ اگر یہ کیا جائے گا تو یقین ہے کہ یہ نئے ملک کی سیاسی ہی نہیں بلکہ مادی ترقی کی بھی اعلیٰ ترین ضمانت ہوگی۔ غرض بلالحاظ روایتی، نسلی، تاریخی، تمدنی اور سیاسی امتیازات کے اس دو ایوانی پارلیمنٹ کا نسخہ ہر ملک کے سیاسی نقص کو دور کرنے کے لئے آزادانہ طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ اگر ہر بیماری کے لئے گل بنفشہ منقع، سونف یا کونین مکسچر کا استعمال کیا جائے گا تو بہت جلد شہر ویران اور قبرستان آباد ہو جائیں گے، اور اگر کوئی درزی ایسا ہو جو محض اپنے بدن کا ناپ لے کر کپڑا سیئے اور اپنے تمام گاہکوں کو اسے پہنانے کی کوشش کرے تو اس کی دوکان کا چلنا معلوم۔ یورپ کا کوئی ملک ایسا نہ ہوگا جس میں انگلستان کے نسخے پر عمل نہ کیا گیا ہو اور جہاں انتہائی ناکامی نہ ہوئی ہو۔ جرمنی میں پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہی اور ذمہ داری کے مسئلے کو ٹھکرا دیا گیا، فرانس اور اٹلی میں سیاسی فریق بندی ایک لعنت

ثابت ہوئی اور ان ملکوں میں دس دس بارہ بارہ افراد کی لا تعداد ٹکڑیاں پیدا ہو کر انھوں نے ملکی حکومتوں کو نہایت کمزور کر دیا، روس میں لبرلیت کا ردِ عمل شہنشاہ کی انتہائی قوت اور اس کے بعد بولشویت کی شکل میں رونما ہوا۔ جب اس نسخے کا استعمال مشرقی ممالک میں ہوا تو وہاں بھی ہر جگہ ایک جداگانہ نتیجہ ہی نکلا؛ یعنی ایران کے شاہ قاچار نے دیکھا کہ سیاسیات میں میرا دخل نہیں ہے تو وہ اطمینان سے پیرس جاکر گلچھرے اڑانے لگا، چین میں اس "معیاری عمومیت" کی وجہ سے ہر صوبہ میں ایک سرابنوہ پیدا ہو گیا اور وہ خانہ جنگی شروع ہوئی جس سے فائدہ اٹھا کر جاپان نے یورش کی اور حالت یہ ہے کہ جاپان آہستہ آہستہ چین کے تمام مشرقی صوبوں کو نگلے جا رہا ہے، ترکی میں اس نسخے کے اثر سے پہلے تو ۱۸۵۶ء میں پھر ۱۸۷۶ء میں اور آخر "نوجوان ترکوں" کی تحریک کے بعد سلطنت کا شیرازہ بالکل بکھر گیا۔ جن ممالک میں یہ نسخہ ایک حد تک کارگر ہوا وہ صرف ایسے شمالی ممالک تھے جن کی روایات ایک حد تک برطانوی روایات کے مماثل تھیں یعنی ناروے، سویڈن اور ڈنمارک۔

دستورِ انگلستان کی یہ نقالی انیسویں صدی کے آخر تک بلکہ پہلی جنگ عظیم تک برابر جاری رہی گو رفتہ رفتہ ہر یورپی ملک کے یہ ذہن نشین ہونے لگا کہ تاوقتیکہ ملکی سیاسی روایات پیش نظر نہ رکھی جائے گی کسی قسم کے دستور کی نقل، خواہ وہ کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہو، سود مند نہیں ہوتی۔ پھر ایسے ممالک بھی تھے، جیسے ممالک متحدہ امریکہ اور سوئیٹسان، جہاں عمومیت کا راج تو تھا، لیکن اس عمومیت کا پیکر بالکل مختلف تھا۔ انگلستان کی عمومیت کی شاید سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے

وزیر اعظم دارالعوام کے سامنے اپنے ہر قول و فعل کا ذمہ دار ہے اور اس کی مخالفت پر اسے استعفا دینا پڑتا ہے، لیکن امریکہ کی کیفیت بالکل جداگانہ ہے۔ یہاں وزارت کلیتہً بادشاہ کے بدل یعنی صدر جمہوریہ امریکہ کے سامنے جواب دہ ہے اور صدر جمہور کو بڑی حد تک یہ اختیار حاصل ہے کہ جسے جی چاہے وزیر بنائے اور جسے چاہے اپنی خدمت سے علٰحدہ کردے امریکی پارلیمنٹ جسے کانگریس کہتے ہیں، اسے وزرا کے عزل و نصب پر مطلق کوئی اختیار نہیں، اور آج کون کہہ سکتا ہے امریکہ میں عمومیت رائج نہیں ہے؟ سوئیٹستان میں جو کیفیت ہے وہ اس سے بھی جداگانہ ہے گو نام کو یہاں کے وزرا کو یہاں کی پارلیمنٹ منتخب کرتی ہے لیکن یہ انتخاب محض رسمی ہوتا ہے اور جو اصول یہاں کار فرما ہے وہ یہ کہ جب کوئی شخص ایک مرتبہ وزیر مقرر ہو گیا تو بلا اس خیال کے کہ وہ پارلیمنٹ کی اکثریت والے فریق کا رکن ہے یا نہیں، وہ برابر اس وقت تک وزیر رہے گا جب تک وہ اپنا کام خوش اسلوبی سے چلائے جاتے۔ سوئیس کہتے ہیں کہ جب ہم بیمار ہوں تو کسی تجربہ کار طبیب کو طلب کرتے ہیں، مکان بنائیں تو کسی پرانے تعمیر کار سے صلاح لیتے ہیں، بچوں کو پڑھوانا ہو تو معمر استاد کو چنتے ہیں، ایسا ہے تو کیوں بات بات پہ اپنے دیرینہ تجربہ والے وزیروں کو نکالنے کے درپے ہوں یہی وجہ ہے کہ برخلاف جمہوری فرانس کے، جہاں کی وزارتوں کی زندگی سیاسی فریقوں کی زیادتی اور روز مرہ کے لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے آٹھ نو مہینے سے زیادہ نہ تھی، سوئیٹستان کے وزرا نہایت اطمینان اور آسودگی خاطر سے کام انجام دیتے ہیں اور ایک ایک وزیر اپنے ملک کی خدمت پندرہ پندرہ سولہ سولہ برس تک لگاتار کرتا رہتا ہے اور اپنے ملک کو

فائدہ پہونچاتا رہتا ہے۔ سوئیستان میں عمومیت کا جو ارتقا ہوا ہے اس کی برکت ہے کہ باوجودیکہ اسی ملک میں دو مذاہب کیتھولک اور غالی پروٹسٹنٹ، تین نسلیں یعنی جرمن، فرانسیسی اور اطالوی، اور چار زبانیں یعنی جرمن، فرانسیسی، اطالوی اور رومانش پائی جاتی ہیں، سوئیستانیوں میں جو اتحاد و اتفاق ہے وہ دوسرے ملکوں کے لئے باعث رشک ہے، اور انہوں نے اپنی عمومیت کو ایسے سانچے میں ڈھالا ہے وہاں کی بجائے اس کے کہ سیاسی تنوع کی وجہ سے انتشار ہو، استحکام پیدا ہو گیا ہے۔

یہ سب تفصیل اس لئے پیش کی گئی کہ سامعین کو اس کا اندازہ ہو جائے کہ عمومیت کسی ایک معیاری طرز حکومت کا نام نہیں بلکہ ایسی حکومت کا نوعی نام ہے جس پر عموم کی رائے کسی نہ کسی طرح سے اثر انداز ہوتی ہو۔ لیکن اگر اثر ڈالنے کا طریقہ ملک کی روایات اور تاریخی امتیازات کی بجائے محض عقیدہ پرستی پر مبنی ہو تو پھر ایسی حالت میں کامیابی دیرپا نہیں ہو سکتی۔ ہمارا ملک ہندوستان ابھی تک اسی عقیدہ پرستی میں مبتلا ہے جس سے یوروپی ممالک مدت ہوگی نکل چکے ہیں۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ حال کے زمانے تک عمومیت کی بابت جو کچھ ہمارا علم تھا وہ محض کتابی تھا، اور اس کے عملی پہلو سے آگاہ ہوئے ہیں زیادہ زمانہ نہیں ہوا۔ ہم اصل میں ایسی دور سے ہو کر گذر رہے ہیں جس میں سے ہو کر یوروپی ممالک انیسویں صدی ہی میں گزر چکے۔ بعض مفکروں کا خیال ہے کہ اس وقت ہندوستان جس افسوسناک انتشار کی حالت میں ہے اور جو افراتفری پھیلی ہوئی ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے آنکھ بند کر کے اور اپنے مخصوص حالات کا اندازہ کئے بغیر انگلستان کی نقل اتارنی چاہی۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تک ہندوستان والے

عمومی اصول کو اپنی روایات، تاریخ اور ملکی امتیازات کے سانچے میں ڈھال کر اسی طرح سے اپنا دستور مرتب نہ کریں گے جیسے ممالک متحدہ امریکہ، سوئیٹستان، جنوبی افریقہ اور کناڈا نے اپنے اپنے دستور محض عقیدہ پرستی کو بالائے طاق رکھ کر بنائے اور جب تک یہاں کی سیاست میں واقفیت کا پہلو نمایاں نہ ہوگا اس وقت تک اس ملک کو امن و امان نصیب ہونا مشکل ہے۔

الغرض عمومیت کا مستقبل اسی اصول پر مبنی ہے کہ ہر ملک اپنے اپنے ماحول اور سیاسی کیفیات کے مدنظر اسے اپنے اپنے سانچے میں ڈھالے، یہ نہیں کہ بے سوچے سمجھے کسی دوسرے ملک کے دستور کو اپنا مطمح نظر قرار دے کر اس کے اتباع پر آمادہ ہو جائے۔ کسی ملک کا دستور، خواہ کتنا ہی نظر افروز کیوں نہ ہو سال ہا سال، اور بعض ملکوں میں صدی ہا صدی کے مسلسل ارتقا کا نتیجہ ہوتا ہے، اور یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دستور جس کا ایک طویل پس منظر ہو، ایک ایسے ملک پر کامیابی سے چسپاں ہو سکے جس کی دستوری اور سیاسی روایات بالکل جداگانہ ہوں۔ عمومیت کا مستقبل اس طرز کار پر مشروط ہے کہ ہر ملک کے باشندے خود اپنے ماحول، اپنے قومی کردار، اور اپنی روایات کے بموجب عمومی اصول کی سیوا کریں اور اسے اپنے سانچے میں ڈھالیں۔

آخر میں ایک بات یاد رکھنی ضروری ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور موجودہ صدی میں یورپ کے براعظم میں قومیت کی جو ہوا چلی وہ ابتدا میں تو نہایت خوش آیند معلوم ہوئی اس لئے کہ جیسا اوپر بتایا گیا ہے، ایک طرف تو جرمنی اور اٹلی کے اجزاء اس اصول کے تحت متحد ہو گئے اور دوسرے یورپ والوں کی دیرینہ

مراد بر آئی یعنی سلطنت عثمانیہ کے حصے بکھرے ہو گئے۔ لیکن معاملہ یہاں ختم نہیں ہوا؛ ہوا تند سے تند تر ہو گئی اور ایک طرف اطالوی، دوسری جانب جرمن، پھر اسلافی اُن تمام ملکوں کی آزادی یا الحاق کا مطالبہ کرنے لگے جو ان کے ہم لسان ہونے کے باوجود ان سے علیحدہ تھے۔ جیسا جیسا زمانہ گزرتا گیا، غالی قومیت کے جذبے نے ایک عالمی صورت اختیار کر لی جس کی وجہ سے مختلف قوموں کے درمیان پہلے کشاکش، پھر جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا جو برابر جاری ہے۔ دراصل یہ نام نہاد قومی خودداری ہی کا جلوہ ہے کہ ہر قوم اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگی ہے۔ پہلے تو یورپ اور امریکہ کے سفید فاموں نے اپنے آپ کو کالے، بھورے، پیلے، سرخ لوگوں پر اپنا تفوق جتانا شروع کیا، پھر مغربی یورپ والے اپنے آپ کو اعلیٰ وارفع کہنے لگے، اور اب ہٹلر کہتا ہے کہ میری قوم کو جو فطری سیادت حاصل ہے اس کی ٹکر کوئی قوم نہیں کھا سکتی۔ غالی قومیت کا یہی تخیل ہے جس کے یورپ میں، افریقہ میں، امریکہ میں اور خود ہمارے ملک اور براعظم ایشیا میں خون کی ندیاں بہا دی ہیں اور کوئی عمومیت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک نام نہاد قوم پرستی حد اعتدال پر نہ آئے گی اور صحیح معنے میں بین اقوامیت کا جذبہ پیدا نہیں ہو گا۔

(۱۸؍ جولائی ۱۹۴۱ء)

گو آج کل مشکل سے کوئی ایسا سمجھدار شخص ہوگا جو سیاسی مسائل میں گہری دلچسپی نہ لیتا ہو، لیکن بہت سی سیاسی اصطلاحیں ایسی ہیں جن کے مفہوم کا ابھی پوری طور پر تعین نہیں ہوا تاہم سیاسی مسائل کی بنیاد انہیں پر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ شاید ایسی اصطلاحوں میں سب سے ممتاز اصطلاح قوم اور قومیت کی ہے۔ دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو کسی نہ کسی قوم سے تعلق نہ رکھتے ہوں، گو آج کل کے زمانے میں نازیوں اور ان کے رہنما اڈولف ہٹلر کی حکمت عملی کی وجہ سے ایسے لوگوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے اس لئے کہ لاکھوں کروڑوں ایسے ہیں جنھوں نے جنم جرمنی میں لیا، وہیں ان کا نشو ونما ہوا، وہی کی بولی بولی لیکن باوجود ان تمام باتوں کے ہٹلر نے ان کی دھن دولت اپنے قبضے میں کرکے انھیں "ان آریہ" کہہ کر ملک سے باہر نکال دیا۔ موجودہ جنگ میں جو ملک جرمنی کی نام نہاد صیانت میں آتا ہے وہاں کے لاکھوں باشندے ملک بدر کردے جاتے ہیں اور

بے خانماں پھرنے کے لئے چھوڑ دئے جاتے ہیں۔ بہر حال اس حد تک کہ ہر شخص اپنے آپ کو کسی نہ کسی "قوم" کا رکن سمجھتا ہے، اس لفظ کا مفہوم آسان ہونا چاہیے؛ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کا مفہوم ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اور ہماری آنکھوں دیکھتے دیکھتے بدلتا جارہا ہے۔

صرف مشرق ہی میں نہیں بلکہ مغرب کی تاریخ میں انقلاب فرانس سے پہلے زمانہ حال کے مفہوم میں قومیت کا تخیل بالکل مفقود تھا۔ بہت سوں کو اس پر تعجب ہوگا کہ گو مشرق میں ہمیشہ سے مذہب کا اثر چلا جارہا ہے لیکن یہاں کبھی اس قدر شدت سے مذہب کے نام پر لڑائیاں اور خونریزیاں نہیں ہوئیں جتنی یورپ میں؛ اور ایک دو نہیں بلکہ تیس تیس چالیس چالیس برس تک یورپ کے لوگ محض مذہبی رسوم اور عقیدوں کی وجہ سے ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہے ہیں۔ پھر بلالحاظ کسی قومی جذبے کے 'محض خاندانی ورثہ'، جہیز، اور تحفوں کی بنا پر ملک کے ملک ایک سے لے کر دوسرے کے سپرد کردئے جاتے تھے، ان کی کاٹ چھانٹ کی جاتی تھی، حق شوہری اور حق زوجگی میں منتقل کئے جاتے تھے اور کبھی باشندوں سے نہ پوچھا جاتا تھا کہ تم کس کی ماتحتی میں رہنا چاہتے ہو۔ جن لوگوں کو تاریخ ہند کی مبادیات سے بھی واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ خود جزیرۂ بمبئی شاہ پرتگال نے اپنی بیٹی کے جہیز میں اپنے داماد چارلس دوم شاہ انگلستان کے سپرد کیا تھا۔ کسی ملک کے بادشاہ کی وفات پر اس کے ملک کی اس کے ورثا میں تقسیم ہو جانا یا ورثہ پر دو یا دو سے زیادہ دعویداروں کا آپس میں لڑنا اور ایک دوسرے کو مغلوب کر لینا یا کسی جنسی جذبے کے تحت دوسرے کے ملک پر حملہ آور ہونا، یہ روز مرہ کی باتیں تھیں اور

اس کاٹ چھانٹ میں قومیت کے اصول کو مطلق کوئی دخل نہ تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک بولی، ایک تمدن، ایک مذہب کے لوگ مختلف اقوام میں بٹے ہوئے ہوں، جیسے پرانے زمانے کے یونانی اور زمانہ وسطیٰ کے اطالوی بہت سی مملکتوں میں بٹے ہوئے تھے، اور حال حال تک، باوجودیکہ جرمنی اور آسٹریا کے درمیان کوئی نسلی یا لسانی فرق نہ تھا۔ لیکن ان دونوں کے باشندوں کی قومیں جدا گانہ سمجھی جاتی تھیں

اصل میں قومیت کے اس تشخصی تخیل کو سب سے پہلا دھکا اس وقت لگا جب ممالک متحدہ امریکہ نے انگریزوں کا جوا اپنے کندھوں سے اتار کر پھینک دیا اور دنیا کے سامنے گویا اس کا اعلان کر دیا کہ محض تشخصی اقتدار کے ماورا کوئی ایسا مجموعہ بھی ممکن ہے جس کا بندھن یک جہتی کی خواہش ہو، اور یہ مجموعہ اس قدر طاقتور ہو سکتا ہے کہ زبردست فوجیں اور عظیم الشان وسائل کے ہوتے ہوئے دوسروں سے اپنا وجود منوا سکتا ہے۔ یہ تو اس تخیل کی ابتدا ہوئی۔ اس کے چند ہی سال بعد اسے انقلاب فرانس اور پولستان کی تقسیم سے بڑی تقویت پہونچی۔ انقلاب فرانس کے بعد محض ایک بے سری قوم تمام یورپ سے جنگ آزما ہوتی ہے اور فتحمند ہوتی ہے، اور ادھر مشرقی یورپ میں پروشیا، آسٹریا اور روس پولستان کے زندہ جسم کی قطع و برید کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پولستان مردہ ہو گیا، لیکن پولستانی قوم زندہ رہتی ہے اور بار بار اسی پروشیا اور اسی روس سے اپنا لوہا منواتی ہے۔

قوم Nation اور قومیت Nationality میں جو فرق ہے وہ بھی سمجھ لینا چاہیئے۔ پچھلی صدی کے سیاسی ارتقا کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ

قوم کا براہ راست تعلق جغرافی کیفیات سے ہو گیا ہے' اور اس سے مراد انسانوں کے اس مجموعے کے ہو گئے ہیں جو کسی معین جغرافی رقبے میں آباد ہو اور ساتھ ہی آزاد بھی ہو۔ اس کے اور مملکت State کے درمیان جو فرق ہے وہ ایک بڑی حد تک نقطۂ نظر کا فرق ہے۔ مملکت ۔ قوم کی تنظیمی کیفیت کو کہتے ہیں قوم گویا افراد کا معین مجموعہ ہے اور مملکت اس کی منظم کیفیت جس کا سب سے بڑا مظاہرہ حکومت کی شکل میں ہوتا ہے۔ ہم انگریزی قوم' فرانسیسی قوم' اطالوی قوم ہسپانوی قوم' امریکی قوم' چینی قوم' ترکی قوم' کا مفہوم بغیر کسی مزید تشریح کے اچھی طرح سے سمجھ سکتے ہیں۔

گو قومیت کا لفظ "قوم" ہی سے نکلا ہے' لیکن اس کے مفہوم میں ذرا سا فرق ہو گیا ہے۔ قوم کا لفظ تو جغرافی رقبے کے اندر رہنے والوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے لیکن کسی قومیت کے لئے ضروری نہیں کہ کسی جغرافی رقبہ کے اندر محدود و منظم ہوں۔ ہم جانتے ہیں کہ بعض مرتبہ قوم اور قومیت کو ایک دوسرے کا ہم معنے سمجھ لیا جاتا ہے۔ مثلاً معمولی گفتگو میں ہم یہودیوں کی قوم کا ذکر کرتے ہیں حالانکہ وہ تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی کوئی سیاسی وحدت نہ ہے نہ شاید ممکن ہے۔ اسی طرح اسلام کا ہر رکن جماعتی تنظیم کے تخیل پر مبنی ہے' اور خدا کے ایک ہونے کے عقیدے سے سب کی برابری' زکوٰۃ سے غربا کی معاشی ترقی' نماز اور حج سے جماعتی یکسانی اور باہمی تعلقات' اور روزے سے ضبط و نظم سکھایا جاتا ہے اور یہ وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے کسی زمانے میں تمام عالم کے مسلمان ایک ہی سیاسی تنظیم میں پرو دئے گئے تھے۔ لیکن آج وہ دنیا کے ہر حصے میں پھیل گئے ہیں

اور ہر اسلامی ملک کی سیاسی حیثیت اور سیاسی تنظیم جداگانہ ہے۔ چند سال پہلے کوشش کی گئی تھی کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو از سر نو ایک سیاسی رشتے میں جوڑ دیا جائے لیکن پچھلی جنگ عظیم میں خیال تقریباً فنا ہو گیا، اور "عالمگیر اسلامیت" کی جو شکل لوگوں کے ذہنوں میں تھی وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسانوں کا کوئی مجموعہ قوم کیسے بنتا ہے؟ کہا جا سکتا ہے کہ قوم بننے کے لئے ایک ہی بولی کی ضرورت ہے۔ زبان ہی کے ذریعے ایک شخص دوسرے کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے؛ اگر یہ ممکن نہ ہو تو یقیناً افہام و تفہیم مشکل ہو جائے گی اور یکجہتی کی کوئی صورت نہ نکل سکے گی۔ زبان کے ایک ہونے کا اتنا اثر پڑتا ہے کہ بعض دفعہ دور دراز ملکوں کے باشندے محض ہم لسان ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ایک ہی قومیت کا فرد سمجھتے ہیں ایسی دور افتادہ قومیت کی زندہ مثال انگلستان اور ممالک متحدہ امریکہ کے تعلقات سے ملتی ہے اور ان دونوں ملکوں کے باشندوں نے کم از کم فی الحال اپنے آپ کو ایک ہی قومیت سے وابستہ سمجھ لیا ہے۔ لیکن ہم نظر غور سے دیکھیں تو محسوس کریں گے کہ قوم کی ساخت کے لئے ہم لسان ہونا لازمی نہیں، اور کئی زندہ مثالیں ملیں گی کہ ایک قوم والے ایک سے زیادہ بولیاں بولتے ہوں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کناڈا کے انگریزی اور فرانسیسی بولنے والے اور جنوبی افریقہ کے انگریزی اور ولندیزی بولنے والے، نہایت صلح و آشتی کے ساتھ رہتے ہیں اور وہاں جو بھی سیاسی فریق ہیں ان میں یہ دونوں عناصر شامل ہیں۔ جب مختلف زبانوں والی آبادی کلیتہً ایک حصہ ملک میں رہتی ہو اور دوسری آبادی سے ممتاز ہو تو ایسی حالت میں وہ ایک

جداگانہ قومیت کہلاتی ہے، جیسے جزائر برطانیہ میں ویلزی جن کی زبان اور رقبہ بالکل جداگانہ ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ سیاسی اعتبار سے انگریزوں کے ساتھ مل کر شیر و شکر کی طرح ہو گئے ہیں۔ یہی کیفیت ایک حد تک روس کی مختلف قومیتوں کی بھی ہے۔ ایک ہی قوم میں متعدد زندہ بولیوں کے ہونے کا سب سے سبق آموز مظاہرہ سوئیستان میں ہوتا ہے جہاں جرمن فرانسیسی، اطالوی اور رومانش زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن یہ زبانیں ملک والوں کی انتہائی یگانگت میں کسی طرح کا خلل پیدا نہیں کر سکتیں۔ ابھی دو سال ہوئے میں سوئیستان کے ایک ایسے گاؤں میں مقیم تھا جہاں جرمن زبان بولی جاتی تھی۔ یہ زمانہ میونخ کے معاہدے سے چند روز پہلے کا زمانہ تھا اور ہٹلر کی ڈینگوں سے فضا بھری ہوئی تھی۔ میں نے ایک سوئیس دوست کو ذرا چھیڑنے کی غرض سے اس سے کہا کہ تمہیں کیا غم ہے، ہٹلر تو تمہارا ہی ہم قوم ہے، تمہاری زبان بولتا ہے، آئے گا تو تم اس کا سواگت کرو گے۔ اس پر اس جرمن زبان بولنے والے سوئیس کا چہرہ سرخ ہو گیا، وہ کہنے لگا کہ آپ کہتے کیا ہیں؟ جب تک ہم سوئیس لوگوں کے بدن میں ایک قطرہ خون کا باقی ہے اس وقت تک ہم کسی جرمن کو بھی اپنے ملک میں گھسنے نہ دیں گے۔

یہی کیفیت نسل کی بھی ہے۔ ہٹلر کا تو یہ بیان ہے کہ جرمن خالص آریہ نسل کے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قومیت ایک ہی نسل کے انسانوں سے مرکب نہیں۔ کونسا ایسا ملک ہے جس پر دوسرے ملک والوں نے حملے نہ کئے ہوں اور اس ملک میں اپنا بیج نہ چھوڑا ہو۔ شاید کسی ہندوستانی قومیت کو اپنے خالص ہونے پر اس سے زیادہ فخر نہیں جتنا پٹھانوں کو ہے، لیکن کونسی ایسی قوم ہے جو شمال مغرب

ہندوستان آئی ہو اور جس نے افغانستان میں اپنے نسلی آثار نہ چھوڑے ہوں
اصل میں جرمن قوم فرینکوں، اسلافیوں، شمالیوں، ہنوں، لومبارڈیوں، یہودیوں
بیسیوں دوسری قومیتوں کا مجموعہ ہے۔ اور بہت سے ایسے لوگ ہیں جو خود ہٹلر
ہی کو یہودی النسب سمجھتے ہیں اور اس کے ثبوت میں یہ دلیل پیش
کرتے ہیں کہ آج بھی رومانیہ کے پائے تخت بخارست کے یہودی قبرستان میں
میں ایک قبر موجود ہے جس کی لوح پر الفاظ "اڈولف ہٹلر" کندہ ہیں
اور یہ اس یہودی کا نام ہے جو ۱۸۸۲ء میں یہاں دفن ہوا تھا۔ یہی کیفیت
مذہب کی بھی ہے۔ ایک زمانہ ضرور ایسا گذرا ہے جب قومیت کی بنیاد مذہب
پر تھی، اور عیسوی دنیا میں تو یہ بنیاد اس قدر مضبوط تھی کہ جب احتجاجیوں
Protestants نے اسے ہلانا چاہا تو اس کے نام پر لاکھوں انسان موت کے
گھاٹ، اور وہ بھی سخت ایذا کے ساتھ اتار دیے گئے۔ آج بھی نازیوں کا اصول ہیا
شاید سب سے ممتاز یہی ہے کہ یہودی اچھوت اور ملیچھ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ گو
مذہب کا تعلق انسان کی ذات اور اس کی ضمیر سے ہوتا ہے لیکن اس کی شدت
ایک طرح کے تمدن اور تہذیب کی علمبردار ہو جاتی ہے اور ایک مذہب والے
اپنے ہم مذہبوں کو اپنے بھائی سمجھنے لگتے ہیں اور اس طرح قومیت کی تکمیل میں
ممد و معاون ہو جاتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قومیت کے قیام و استحکام میں زبان، نسل،
مذہب، جغرافی کیفیات سے بھی زیادہ کوئی دوسرا جذبہ کار فرما ہے۔ یہ جذبہ دراصل
باہمی تعامل کی خواہش ہے۔ جیسا ایک فرانسیسی سیاست دان کا قول ہے "یہ سب

عناصر قومیت کی ترکیب اور امتزاج میں مدد دیتے ہوں لیکن فی نفسہٖ ان میں سے کسی سے بھی قوم نہیں بنتی اور نہ ان میں کسی کے نہ ہونے سے قومیت کو زوال آتا ہے۔ قومیت دراصل ایک خالص روحانی جذبے اور احساس کا نام ہے اور اس جذبے اور اس احساس کا لب لباب یہ ہے کہ افراد یہ طے کرلیں کہ ہماری زبانوں میں فرق ہو تو ہونے دو، ہماری نسلیں مختلف ہوں تو پرواہ نہیں، ہم مختلف مذاہب کے پیرو ہوں تو مضائقہ نہیں، ہم کسی چیز پر متفق اور متحد ہیں تو وہ یہ ہے کہ ہم اپنی قوم اور قومیت کی ہر طرح سے خدمت کرنا اپنا فرض سمجھیں گے اور ضرورت پڑے تو اپنا تن من دھن اس یکجہتی پر قربان کردیں گے محض ایک مملکت کے اندر اپنے سے لازماً قوم یا قومیت نہیں بنتی تاوقتیکہ یہ جذبۂ تعامل یعنی ملکر کام کرنے کا جذبہ پیدا نہ ہو، اور یہ مبنی ہوتا ہے ایک مشترک تمدن پر۔ کسی مملکت کے اندر بھی کئی تمدن کارفرما ہو سکتے ہیں، اور ہر تمدن والے اپنی اپنی قومیت جداگانہ تصور کریں گے خواہ وہ دوسروں کے ہم مذہب یا ہم لسان ہی کیوں نہ ہوں۔ لوگوسلافیہ کے کروٹ، آیرستان کے آیرستانی، بلجیم کے فلیمنگ، ہندوستان کی مختلف قومیتیں، ان سب کا تفرد اس وقت تک قائم رہے گا جبتک یہ کسی نہ کسی وجہ سے دوسرے جزو آبادی کے ساتھ پوری طور پر ملک کی خاطر تعاون و تعامل کرنے کے لئے تیار نہ ہوجائیں گے، اور ملک کی بہبود کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ وہ تمام رکاوٹیں جو اس اعلیٰ تخیل کے راستے میں حائل ہوں، ہٹادی جائیں تاکہ باوجود اپنے تفرد کے ملک کی مختلف قومیتیں ملک کی سیوا میں نچھاور ہونے کے لئے تیار ہوجائیں۔

عالمی وفاق کا مسئلہ

(۲۰ جولائی ۱۹۴۱ء)

اس وقت جب جنگ کے شعلے تقریباً تمام یورپ اور ایشا میں بھڑکے ہوئے ہیں اور اس کی لپیٹ سے باقی تمام براعظم متاثر ہوئے نہیں رہ سکتے، عالمی وفاق کے مسئلہ پر کچھ کہنا ایک دور از کار اور لاطائل بات معلوم ہوتی ہے۔ تقریباً تمام براعظم یورپ پر ہٹلر بزورِ شمشیر قابض ہو گیا ہے، جاپان میں مشرقی ایشیا کے مستقبل کا ایک نیا نظریہ قائم کیا گیا ہے اور اس نظریہ پر یہ ملک سو فی صدی عمل پیرا ہونے کے لئے کوشاں ہے بلکہ اب تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہ محض مشرقی ایشیا پر قناعت نہ کرے بلکہ جنوبی ایشیا کو بھی اپنی توجہ آرزوؤں اور حوصلوں کے محور میں لے آئے۔ ممالک متحدہ امریکہ پہلے ہی سے براعظم امریکہ پر ایک بڑی حد تک اثرانداز ہے، اور افریقہ اس دن سے جب قیصر ولیم نے جرمن علم اس براعظم پر گاڑا، تمام ممالک یورپ کا آماج گاہ بنا ہوا ہے تو ایسی حالت میں عالمی وفاق کا مسئلہ بظاہر صدا بہ صحرا سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لیکن یہ بھی یقینی امر ہے کہ ہر جنگ یا ہر امن کے زمانہ کی

انتہا بھی ہوتی ہے اور اگر دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ سمجھ میں آئے گا کہ ہر امن کے دور کے بعد جنگ کی طرف ایک ردعمل اور ہر جنگ کے بعد اس کی طرف ایک ردعمل ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ جتنی زبردست اور جتنی عالمگیر جنگ ہوگی اتنی سختی اور تشدد کے ساتھ اس کے خلاف ردعمل ہوگا اور تھکے ہوئے فاتح اور ہزیمت خوردہ مفتوح دونوں فریق ایسی تدبیروں پر سوچ بچار کرنے لگیں گے کہ جن سے جنگ کی لعنت کو اس دنیا سے دور کیا جا سکے۔ یہ ردعمل در اصل جنگ کے دوران میں ہی شروع ہو جاتا ہے اس لئے کہ جنگ میں جو ہزاروں لاکھوں آدمی جان بوجھ کر اپنے آپ کو موت کے حوالہ کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں اور موت کے گھاٹ اتار دئے جاتے ہیں ان کے پسماندے جو غالب اور مغلوب دونوں طرف پھیلے ہوتے ہیں یقیناً ان کے دلوں میں پہلے ہی دن سے جنگ کی ہلاکت آفرینی کے بے سود اور نقصان رساں ہونے کے جذبے پیدا ہو جاتے ہونگے۔

یہ ردعمل جنگ عظیم کے سلسلہ میں بھی پیدا ہوا اور یہ ہماری یاد کا واقعہ ہے کہ کس طرح اس صدی کی ابتدا سے برابر بڑے بڑے مفکر اس سوچ میں رہے کہ کیسے جنگوں کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ کیمیائی انکشافات کی وجہ سے انسان نے اپنے ہمجنسوں کے مارنے کے نت نئے طریقہ اختیار کر لئے تھے اور ان کی آتش فشانی میں روزمرہ اضافہ ہو رہا تھا۔ شاید اس سے ڈیکر ۱۸۹۹ء میں ولندستان کے پایۂ تخت ہیگ میں کانفرنسوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جن میں کوشش کی گئی کہ آیندہ تمام بین اقوامی جھگڑے پنچائت کے ذریعہ طے پایا کریں اسی سلسلہ میں ایک بین اقوامی عدالت بھی قائم کی گئی اور طرح طرح کے بین اقوامی ادارات جیسے

ڈاک اور تار، صلیب احمر وغیرہ کے اتحادات بنائے گئے۔ لیکن یہ تمام کوششیں زیادہ تر یورپ میں امن قائم رکھنے کی تھیں، اور جب اٹلی نے طرابلس پر بغیر کسی وجہ کے حملہ کیا تو امن پسندی کے اصول کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ بہر حال جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کی وجہ سے جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا وہ ۱۹۱۴ء میں شہود پر آ گیا اور ایک عظیم الشان جنگ کی ابتدا اس سال میں ہوئی جو چار برس مسلسل جاری رہی۔

یوں تو پندرھویں صدی عیسوی ہی سے یورپ والے اس فکر میں تھے کہ کسی نہ کسی قسم کا عالمی نہیں، تو یورپی یا عیسوی اتحاد پیدا ہو جائے تاکہ جنگ کا خاتمہ ہو۔ ان کے سامنے دو عظیم الشان تاریخی مثالیں اس قسم کے اتحاد کی تھیں یعنی خلافت اسلامیہ اور مقدس سلطنت روما، لیکن ان اتحادوں کو دفاقیہ کا نام نہیں دیا جا سکتا اور رفتہ رفتہ دونوں ادارات میں یہ محسوس ہونے لگا کہ ان دونوں سلطنتوں کے مختلف حصے اتنے قوی ہو سکتے ہیں کہ ان کے سامنے مرکزی اقتدار صفر کے برابر رہ جائے گا۔ چنانچہ مشرق میں غزنوی، سلجوقی، بویہی، ایوبی اور دوسری ایسی ہی سلطنتیں بن گئیں جنھوں نے خلافت کو بالآخر بالکل مٹا دیا۔ اُدھر مغرب میں انگلستان، فرانس، اسپین، اٹلی، اور پروشیا نے اپنے اپنے سر اٹھائے جس سے مقدس شہنشاہ روما کا تقدس اور شہنشاہی دونوں ختم ہو گئے۔ اصل میں کسی بڑے دفاقیہ کی مثال اس وقت تک قائم نہیں ہوئی جب تک کہ انگلستان کی تیرہ امریکی نوآبادیوں نے ایک کامیاب بغاوت کر کے مغربی براعظم میں لاکھوں بلکہ کروڑوں مربع میل کے ایک عظیم الشان وفاقیہ کی بنیاد نہیں ڈالی جو ممالک متحدہ امریکہ کی شکل میں اس وقت تمام دنیا کی نظروں کا مرکز بنا ہوا ہے۔

گویا اٹھارھویں صدی کے آخری سالوں میں ایک ایسے وفاقیہ کا تخیل قائم ہوا جو ایک بڑے حصہ دنیا پر حاوی ہو۔ اسی خیال کو لیکر نپولیونی جنگ کے بعد یورپ میں یہ کوشش کی گئی کہ بین اقوامی معاملات باہمی گفت وشنید کے ذریعہ سے نہ کہ بزور شمشیر طے کئے جایا کریں۔ لیکن جیسا اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے یہ کوشش کارگر نہیں ہوئی اور جولائی ۱۹۱۴ء آخری ہفتہ میں دنیا نے اس وفاقیہ کے تخیل کو ٹھکرا کر چار سال تک بنی نوع انسان کو اور تہذیب وتمدن کے تمام اصول کا خاتمہ کرنے کی ٹھان لی۔ جنگ ختم ہونے سے پہلے ہی وڈرو ولسن صدر جمہوریہ امریکہ نے ایک طرح کے عالمی وفاق کا مسئلہ عملاً تمام دنیا کے سامنے پیش کیا اور یہ اس نیک مرد کے چودہ نقاط میں سے ایک تھا جس میں سے ایک کو بھی وہ منوانے میں مشکل سے کامیاب ہوا۔ اس کا مقصد تو یہ تھا کہ تمام عالم کی مملکتیں اسی طرح سے ایک مستقل اور مستحکم وفاق میں شامل ہو جائیں جس کی مثال اس کے اپنے ملک میں ڈیڑھ سو برس پہلے قائم کر دی تھی؛ لیکن نتیجہ نکلا اس انجمن اقوام کی شکل میں جس کی بابت علامہ اقبال فرما دیا ہے:-

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

انجمن اقوام پر غالب فریق نے بلا شرکت غیرے کئی سال تک حکومت کی۔ اس کی رکنیت ایک طرح پر کسی ملک کے قابل لحاظ ہونے کی سند تھی اور مملکتیں اس کی متمنی ہوتی تھیں کہ اس کے کسی نہ کسی ادارہ میں ان کو رکنیت کا حق مل جائے۔ چنانچہ جرمنی کے افعال سے یہ ظاہر ہوا کہ اب وہ کسی قسم کی مزید توسیع

سلطنت کا آرزومند نہیں تو اس پر گویا یہ احسان کیا گیا کہ اس کو انجمن اقوام میں شریک کر لیا جائے۔ رفتہ رفتہ جب اطالوی فاشیت کے برسراقتدار ہونے کے بعد چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو اس کا احساس ہونے لگا کہ انجمن اقوام در اصل چند بڑی سلطنتوں کی آمریت کا ایک آلہ ہے اور حقیقی معنے میں باوجود تمام ادعاوں کے وہ ان سلطنتوں کے اقتدار کو قائم رکھنے کے سامنے مساوات کی پروا نہیں کرتی تو اس کے خلاف اٹلی کی جانب سے ایک طرح کی بغاوت کا جذبہ پیدا ہو گیا اور اس جذبہ کو پہلے جاپان کے حملہ منچوریا اور پھر اٹلی کے فتح حبشہ کی وجہ سے بڑی تقویت پہنچی۔

حقیقت یہ ہے کہ انجمن اقوام عالمی وفاقیت کا پہلا تجربہ تھا اور آپ سمجھیں کسی مملکت کے جو تین بڑے بڑے اعضا یعنی مقننہ، عاملہ اور عدلیہ ہوتے ہیں ان سب کا چربہ اتار ا گیا تھا۔ مقننہ کی جگہ ایک اسمبلی تھی جس میں ہر رکن مملکت کے تین تین نمایندے ہوتے تھے اور ہر سال اس کا کم از کم ایک جلسہ ستمبر کے مہینے میں ہوتا تھا۔ کابینہ کے مماثل جو ادارہ تھا اسے "مجلس" کہتے تھے جس میں چار مستقل ارکان اور چار غیر مستقل ارکان بیٹھتے تھے اور اکثر معاملات جو مجلس میں پیش ہوتے تھے محض کثرت رائے سے طے کیے جاتے تھے، گو اہم معاملات میں اتفاق رائے ضروری تھا۔ طے شدہ امور کی اطلاع مختلف دول کو کرنے اور عہد ناموں کی تسجیل کا کام ایک معتمدی کے سپرد تھا جس کا سب سے بڑا افسر معتمد اعلیٰ اور اس کے ماتحت تین مددگار معتمد تھے۔ گو ہیگ کی بین اقوامی عدالت ایک آزاد ادارہ تصور کی جاتی تھی لیکن اس کا نہایت گہرا تعلق انجمن اقوام سے تھا

بعض حصہ جات دنیا پر انجمن اقوام کا براہ راست انتظام بھی چلتا تھا، اور اسی انجمن کے ماتحت علاقہ سار اور شہر ڈانزگ کے انتظامات پر اس کا دخل تھا اور ایسے علاقوں کو جو اس کے نزدیک کافی ترقی یافتہ نہ تھے اس نے بڑے بڑے تجربہ کار دول جیسے انگلستان، فرانس وغیرہ کے سپرد کر دیا تھا۔

بہرحال جاپان کے حملہ منچوریا اور اٹلی کی فتح حبشہ سے یہ معلوم ہو گیا کہ باوجودیکہ انجمن کے پاس تہدیدوں Sanctions کا آلہ کار تھا، جس کے ذریعے سے کم از کم کاغذ پر کسی مجرم مملکت کو جو بغیر کسی ٹھیک سبب کے دنیا کے امن دامان میں خلل ڈالتی، عالمی برادری سے خارج کر کے اسے زچ کیا جا سکتا تھا بلکہ تمام ارکان کی طرف سے اس پر فوج کشی بھی کی جا سکتی تھی لیکن ہر بڑی اور چھوٹی مملکت کے اغراض ایک دوسرے سے ایسے وابستہ تھے کہ کسی معاملے میں کسی ہمسایہ سلطنت یا کسی بڑی سلطنت کو ناراض کرنے سے ہر مملکت گریز کرتی تھی جیسا جیسا زمانہ گزرتا گیا، انجمن اقوام کی بے بسی بڑھتی گئی اور ہٹلر کے برسراقتدار ہو جانے کے بعد تو وہ عہدنامہ جس پر انجمن اقوام کے تمام ڈھانچے کی بنیاد تھی اس نے پھاڑ کر پھینک دیا اور انجمن منہ دیکھتی رہی یا زیادہ سے زیادہ قراردادیں منظور کرتی رہی۔ ایک زمانہ ایسا آیا کہ انجمن کی رکنیت کو عزت کی جگہ ذلت سمجھا جانے لگا اور جرمنی نے، جاپان نے، اٹلی نے اور بعض دوسری مملکتوں نے یکے بعد دیگرے اسے چھوڑ کر اور اسے بے دست و پا کر کے عالمی وفاق کے پہلے تجربہ پر کاری ضرب لگا دی۔

جس طرح پچھلی جنگ عظیم کے دوران ہی میں منکروس ذاریوں لگ گئے تھے

کیسے آیندہ جنگ کا خاتمہ کر دیا جائے اسی طرح اس موجودہ جنگ کے دوران میں بھی وہ اسی قسم کی فکر میں لگ گئے ہیں۔ جرمنی اور جاپان کے منصوبے الم نشرح ہیں۔ اگر ان کی آج کی روش کل کے طرز عمل کی کوئی ضمانت ہو سکتی ہے تو ان دونوں کی کامیابی کی صورت میں، جس طرح پولستان کی سرحد سے اقصائے مشرق تک تمام رقبہ روس کے ماتحت ہیں، اسی طرح "نئی عالمی تنظیم" کے معنے یہ ہونگے کہ کم از کم تمام مشرقی ایشیا پر جاپان کا اور تمام یورپ پر جرمنی کا علم لہرائے گا، اور ان عظیم الشان رقبوں پر اس کے آزادی یا مقامی خود مختاری کا شائبہ بھی نہ ہوگا جو وفاقیہ کی گویا جان ہوتی ہے۔ جرمن لغت میں نئی سناری تنظیم کا صرف یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ ماتحت ممالک کے معاشی وسائل جرمنی کے قبضے میں آجائیں اور ان کے باشندے معاشی اعتبار سے ان کے دست نگر ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال اور وفاقیہ کے تخیل کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وفاقی اصول کا اگر کوئی مفہوم ہے تو یہی کہ مرکزی اختیارات کی بھی اسی طرح سے حد بندی ہو جیسی مقامی اختیارات کی؛ اور یہ کسی مفتوحہ ملک میں تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ موجودہ حالات کے تحت عالمی وفاق کا مسئلہ اسی وقت پیدا ہوگا جب جنگ کے اختتام پر کسی کی طرف سے بغض، کینہ، حسد کی جذبات نہ ہوں اور غلبہ اور مغلوب کا خیال نہ پیدا ہو؛ اگر ہوگا تو پھر جو اتحاد ہوگا وہ وفاقی نہیں بلکہ شیر اور بکری کے اتحاد کے مماثل ہوگا۔

بہر حال یہ امر یقینی ہے کہ دنیا پچھلی جنگ اور عہد نامہ ورسائی کے اسباق اچھی طرح سے یاد کر چکی ہے، اور مدبروں کا کمال نہیں تو یقین ہے کہ چھوٹی مملکتیں، خواہ

کتنی بھی طاقتور کیوں نہ ہوں، اپنے وسائل کی کمی کے باعث بڑی مملکتوں کے ساتھ مساوات کا دعویٰ نہیں کر سکتیں، اور ان کے لئے یہی بہتر ہے کہ کسی طاقتور مملکت سے اپنے تعلقات بڑھائیں اور ان کے زیر حمایت آجائیں۔ عہدنامہ دیرسائی کی رو سے چھوٹی سے چھوٹی مملکت، مثلاً چند سو مربع میل کی لگزمبرگ اور کروڑوں مربع میل کا روس، ان سب کی کاغذ پر ایک ہی حیثیت تھی، لیکن ظاہر ہے کہ دونوں کی قوت، اقتدار اور اثر میں زمین و آسمان کا فرق تھا، اور جب کبھی کوئی اول درجہ کا مسئلہ جیسے اٹلی کے خلاف تہدیدیں عاید کرنے کا سوال سامنے آتا تو چھوٹی چھوٹی مملکتیں اپنی بڑی طاقتور بہنوں کا منھ تکا کرتیں۔ یہ فرق انجمن اقوام کی عالمانہ جماعت میں بھی نظر آتا تھا جہاں بڑی بڑی سلطنتوں کو تو "مجلس" میں مستقل نشستیں حاصل تھیں، اور چھوٹی چھوٹیوں کو انتخاب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

اگر موجودہ جنگ کے بعد اصول جنگ کے خلاف اتنا ردعمل ہو کہ فاتح خود اپنے ملک یا اپنے زیر نگین ملکوں کی تباہی اور بلا کسی ذاتی جرم کے لاکھوں نفوس کی ہلاکت سے متاثر ہو کر واقعی کسی عالمی وفاق کی کڑی میں منسلک ہونے کے لئے تیار ہو گئے، تو چھوٹی چھوٹی مملکتوں کو ایسے علاقہ داری وفاقیوں میں شامل ہونا پڑے گا جن کے وسائل اور جنگی قوت مساوی ہو۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جنگ کا باعث قومیت کا غالیانہ تخیل ہوتا ہے جس کے بموجب انسان کو سکھایا جاتا ہے کہ محض ایک جغرافی رقبے میں رہنے والوں کا فرض ہے کہ نہ صرف اس کی حفاظت کے لئے جان دے دیں بلکہ اسے تمام دوسرے رقبوں سے بالاتر سمجھیں اور موقع ملے تو ہمسایہ رقبوں کو زیر کرکے دنیا سے اپنا تفوق منوائیں۔ غور کیا جائے تو تمام دنیا کے

فسادات، لڑائیاں، جنگیں سب ایسی ہی غالیت اور بیجا تفوق کے مظاہرے ہوتے ہیں۔ آیندہ زمانے میں اگر کوئی دیرپا وفاق قائم ہوا تو صرف اسی اصول پر ہوگا کہ دنیا میں سیاسی اکائی بجائے غیر مساوی جغرافی مملکتوں کے ایسے علاقے ہوں جن میں یہ غیر مساوی مملکتیں شامل ہوں، اور جو خواہ رقبے کے اعتبار سے ورنہ وسائل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے کم و بیش مساوی ہوں۔ جغرافی مملکت انقلاب فرانس کی پیداوار ہے، اور باقی ماندہ "انقلابی" اصول کی طرح اس موجودہ جنگ کے بعد ملکی مملکت کا تفرد ختم ہو جائے گا اور ایک وسیع تر رقبہ اس کی جگہ لے لے گا۔ دوسرے اگر ہم غور کریں تو یہ عجیب واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ اکثر جن ممالک کا رقبہ بہت سوں سے زیادہ وسیع ہے وہ ان ممالک سے کمزور ہیں جو رقبے کے اعتبار سے چھوٹے ہیں، اور چونکہ آخر کار سیاسی اقتدار کا دار و مدار قوت پر ہوتا ہے اس لئے نہ صرف بین اقوامی ہئیت بلکہ ملک کے اندر مختلف طبقوں کی نمایندگی میں بھی محض اکثریت یا اقلیت کا اصول نہیں برتا جا سکتا۔ بہرحال اس میں شبہہ نہیں کہ محض دست شماری کے میکانی اصول کو نظر انداز کرنا ضروری ہوگا۔ یورپ سب سے چھوٹا براعظم ہے اور اس کی آبادی بھی سب سے کم ہے، لیکن اس کی مجموعی طاقت پر کون شبہہ کر سکتا ہے، اور اس کے لئے وہ کبھی بھی تیار نہ ہوگا کہ عالمی تقسیم رقبے یا آبادی کی مساوات کے اصول پر کی جائے۔ بہرحال، جہاں تک مساوی رقبوں کا سوال ہے مستقبل میں صرف مساوات آبادی کا خیال رکھنا ممکن نہ ہوگا بلکہ رقبہ کے وسائل، قوت، سب ہی کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ مثلاً اگر یورپ کے تین یا چار بڑے بڑے حصے، یعنی مغربی، وسطی، مشرقی اور جنوبی کئے گئے، تو ہر رقبے کو مساوی حیثیت دینی پڑے گی۔

عالمانہ تنظیم میں ہمارے سامنے ممالک متحدہ امریکہ اور سوئیتستان کی مثالیں بصیرت افروز ہیں۔ سوئیتستان کی مرکزی عاملہ میں یہ قاعدہ ہے کہ کسی ایک کینٹن سے دو وزرا مقرر نہیں ہوتے، اور اس پر ہر مذہب کی نمایندگی لازمی ہے۔ اسی طرح یہ قاعدہ بنایا جا سکتا ہے کہ عالمی عاملہ میں کسی ایک مجموعے یا براعظم کے نمایندے خواہ آبادی کچھ بھی ہو، مجلس عاملہ کی ایک تہائی تعداد سے زیادہ نہ ہوں گے۔ بعض خیال تو یہ ہے کہ ملکی معاملات میں بھی، اگر جھگڑوں کا انسداد پیش نظر ہے، تو محض میکانی اکثریت اور اقلیت کی بجائے کچھ اسی طرح کے قواعد بنانے پڑیں گے۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام تخیل صرف ایک اصول پر مبنی ہے، اور وہ یہ کہ جملہ اقوام عالم باہمی تعاون اور ہمکاری کے لئے رضامند ہو جائیں، اور باوجود انفرادی تفوق کے امن عالم کی خاطر ایک حد تک قربانی اور ایثار پر آمادہ ہوں۔ اگر یہ نہیں تو کسی قسم کے عالمی وفاق کی اسکیم پر غور و فکر بیکار ہے۔

سیاسیات اور اردو زبان

(۲۹ راکتوبر ۱۹۴۱ء)

ہمارے لئے یہ مسئلہ نہایت دلچسپ ہے کہ ہماری زبان جس کی ابتدا شاید محض بولوں اور کہاوتوں سے ہوئی تھی کس طرح رفتہ رفتہ شعروشاعری کی زبان بن گئی اور اس منزل سے گزرنے کے بعد اس میں تمام وہ شیرینی آگئی جسے فارسی زبان کے ساتھ مخصوص کیا جاتا تھا لیکن اس منزل سے گزرنے کے بعد نثر کے سانچے میں ڈھلنے کے لئے ابھی لمبی مدت دراز درکار تھی۔ امیر خسروؒ اور ملک محمد جائسیؒ کے کئی سو برس بعد تک اردو زبان اس قابل نہیں سمجھی جاتی تھی کہ نثر کی حامل ہو سکے یہاں تک کہ اردو شعرا کے تذکرے بھی فارسی ہی میں لکھے جاتے تھے اور پچھلی صدی عیسوی کے وسط تک انگریزی حکومت کے ایسے اعلانات جن کا انگریزی زبان میں شائع کرنا مقصود نہ تھا اردو میں نہیں فارسی میں شائع ہوئے تھے۔ گو پچھلی صدی عیسوی کے ابتدا میں باغ و بہار، چہار درویش، آرائش محفل اور ایسے ہی دوسرے قصے اردو میں تصنیف ہوئے لیکن اس نثر میں بھی نظم کی طرح

لفظی الٹ پھیر اور مقفیٰ عبارت کو بہت زیادہ دخل تھا اور یہ کوشش خارج از بحث تھی کہ اردو کو علمی جامہ پہنایا جائے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شائد سب سے پہلے جس شخص نے اردو زبان میں علمی مباحث کی ابتدا کی وہ سر سید احمد خاں مرحوم تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے غدر کے فوراً بعد اپنا مشہور و معروف "رسالہ اسباب بغاوت ہند" لکھ کر اردو زبان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ یہ رسالہ جو اپنی نوع کی پہلی کتاب ہے ہماری آج کی صحبت کے لئے اس لئے اور بھی زیادہ دلچسپ ہے کہ یہ ایک سیاسی رسالہ ہے، اور گو ہم میں سے بہت سے اس کی تمہید اور بعض مقامات کی روش سے پوری طور پر متفق نہ ہوں لیکن ہمیں ماننا پڑے گا کہ اس کے دور اندیش مؤلف نے آج سے ۸۰ سال پیشتر ایسے اصول برطانوی حکومت کے سامنے پیش کئے جو اس وقت بھی اس حکومت کے حرز جان قرار دئے جا سکتے ہیں۔ اس کتاب کا اسلوب بیان اس کے چھوٹے سے ملخص سے ظاہر ہوگا :-

"اصلی سبب اس فساد کا میں تو ایک ہی سمجھتا ہوں باقی جس قدر اسباب ہیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں اور یہ سمجھ میری کچھ وہمی اور قیاسی ہی نہیں بلکہ اگلے زمانے کے بہت سے عقلمندوں کی رائے کا اس بات پر اتفاق ہو چکا ہے اور تمام مصنفین پرنسپل آف گورنمنٹ کے اس باب میں میرے طرفدار ہیں اور تمام تاریخیں یورپ اور افریقہ کی میری رائے کی صداقت پر بہت معتمد گواہ ہیں . . . . . . لیجس لیٹف کونسل میں

ہندوستان کے شریک نہ ہونے سے صرف انتہائی نقصان
نہیں ہوا کہ گورنمنٹ کو اصلی مضرت قوانین اور ضوابط کے
جو جاری ہوئے بخوبی معلوم نہیں ہو سکی اور عام
رعایا کو اس مضرت کے رفع کرنے اور اپنے مطالب کے
پیش کرنے کی فرصت اور قدرت نہیں ملی بلکہ بہت بڑا نقصان
یہ ہوا کہ رعایا کو منشاء اور اصلی مطلب اور دلی ارادہ گورنمنٹ کا
معلوم نہ ہوا۔"

یہ ہے غالباً سب سے پہلی اردو تحریر سیاسیات کے موضوع پر اور اس سے
صاف ظاہر ہے کہ باوجودیکہ فارسی میں لفظ سیاست استعمال ہوتا تھا لیکن اس زبان
میں اس کے معنے بہت وسیع تھے اور اردو زبان میں نہ صرف یہ لفظ بلکہ گورنمنٹ کے
معنوں میں حکومت کا لفظ بھی مروج نہ ہوا تھا۔

اس رسالے کے آٹھ سال کے بعد سر سید نے علی گڑھ میں ایک "سئینٹیفک
سوسئیٹی" کی بنیاد ڈالی اور ایک ہفتہ وار رسالہ موسومہ "اخبار سئینٹیفک سوسئٹی
علی گڑھ" نکالا۔ انجمن اور اخبار دونوں کا مقصد ہی یہ تھا کہ اردو زبان میں مختلف
فنون کو منتقل کیا جائے۔ اس اخبار کے سب سے پہلے شمارے (مورخہ ۳۰ مارچ
سنہ ۱۸۶۶ء) میں ایک مضمون پارلیمنٹ پر ہے جس کا ایک پارہ ہدیۂ سامعین
کیا جاتا ہے۔

"پارلیمنٹ ایک نہایت عظیم الشان محکمہ لندن میں ہے اس محکمے کو
امور ملکی کے مشورے کی ایک اعلیٰ مجلس یا انگلستان کی سلطنت کا

ایک قانونی مجمع سمجھنا چاہیئے اس محکمے میں دو درجے ہوتے ہیں
ایک اعلیٰ درجہ جو ہوس آف لارڈ کہلاتا ہے یعنی "امیروں کے
اجلاس کا درجہ" اور دوسرا چھوٹا درجہ جو "ہوس آف کامنز" کہلاتا ہے
یعنی ان رئیسوں اور اشراف لوگوں کے اجلاس کا درجہ۔ جو ہر
ضلعے اور شہر سے وکیل یا عامی رعایا کے منتخب ہوکے آتے
ہیں ہمارے ملک کی اصطلاح کے موافق پہلے درجے کو دیوان
عام کہنا چاہیئے"

اس ملخص سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۶۶ء میں اس بات کی کوشش شروع
ہوگئی تھی کہ نہ صرف یہ کہ سیاسیات کی انگریزی اصطلاحیں اردو میں شرح و بسط
کے ساتھ سمجھائی جائیں بلکہ ان کے لئے اردو الفاظ بھی جہاں تک ہوسکے ان کے
حمال بنائے جائیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اردو میں سیاسی مفہوم کو
صحیح طور پر ادا کرنے میں بڑی دقت کا سامنا ہورہا تھا اور سرسید جیسے انشاپرداز کو
بھی پارلیمنٹ کو ایک قانونی مجمع اور ہاؤس آف کامنز کو رئیسوں اور اشراف لوگوں کے
اجلاس کا درجہ کہنے پر اکتفا کرنا پڑرہا ہے۔

علی گڈھ سائنٹیفک سوسائٹی نے منجملہ دوسرے علوم کے سیاسیات پر بھی
مختلف کتابیں تالیف اور ترجمہ کرائیں جن میں سے ایک مل کی کتاب "ریپرزنٹیٹو
گورنمنٹ" اور دوسری امیر الامرا سید خیر الدین وزیر تونس کی کتاب "اقوام المسالک
فی معرفت احوال الممالک" کے تراجم تھے۔ ان میں سے پہلی کتاب تو نظری سیاسیات
پر اور دوسری ایک حد تک دساتیر پر سمجھنی چاہیئے۔ مل کی کتاب کے ترجمے سے یہ

معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مترجم مولوی ابو الحسن صاحب نے یا تو دقیق عربی الفاظ کا استعمال کیا ہے ورنہ جہاں وہ ترجمہ نہ کر سکے وہاں انگریزی الفاظ پر ہی اکتفا کیا ہے۔ بعض مرتبہ فقروں کی بندش اس لئے گنجلک ہو گئی ہے کہ اس میں انگریزی الفاظ کا تقریباً تحت اللفظ ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ مثال کی طور پر اس کتاب کا جس کا نام "معلم السیاست" رکھا گیا دیباچہ ملاحظہ کیا جائے۔

"اکثر علامات سے علی الخصوص ان مباحث سے جو چند روز ہوئے ہیں کہ پارلیمنٹ کی اصلاح پر ہوئے ہیں مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ لبرل اور کنسرویٹیو دونوں کو ان پولٹیکل مذاہب کا اعتقاد جاتا رہا ہے جن کا اقرار وہ صرف برائے نام کرتے ہیں مگر لطف یہ ہے کہ ان میں سے کسی فریق نے اس سے بہتر پولٹیکل مذہب اختیار کرنے کی فکر نہیں کی ہے حالانکہ ایسے مذہب کا ہونا ممکن ہے اور اس کی کیفیت یہ نہیں ہے کہ فریقین کے اختلافات کو رفع کر کے ایک مصالحہ کی صورت نکال لی گئی ہے۔"

ایک اور پارہ ملاحظہ ہو

"میں یہ نہیں کہتا کہ ایسے امور کی نسبت جو رائے اہل حرفہ کی ہوتی ہے وہ عموماً اور لوگوں کی رائے کی بہ نسبت اقرب الی الصواب یعنی زیادہ صحیح ہوتی ہے لیکن بعض اوقات تو ان کی رائے بھی اسی قدر صحیح ہوتی ہے۔ بہر کیف چاہے ان کی رائے صحیح ہو چاہے غلط اس کو بہ گوش ہوش سن لینا تو ضرور ہے نہ یہ کہ اس سے

روگردانی یا چشم پوشی کی جائے جیسا اب ہوتا ہے مثلاً اہل حرفہ
کے کام چھوڑ دینے کی بحث جو پارلیمنٹ میں پیش ہے مجھ کو اس کا
شک ہے کہ ہوس آف لارڈس یا ہوس آف کامنس کا ایک
سربرآوردہ ممبر بھی ایسا ہے جس کو یہ یقین کلی نہ ہو کہ اس مقدمے
میں مزدوروں کے مالک ہی حق پر ہیں اور بے چارے مزدور
جو کہتے ہیں وہ محض مہمل و مزخرف ہیں۔"

اس اقتباس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مترجم کو نہ صرف بعض الفاظ بلکہ بعض مطالب کا اردو ترجمہ کرنے میں دقت پڑی اور انھوں نے ایک تو بھاری عربی الفاظ اور بندشوں کو استعمال کرکے اس دقت کو چھپا دیا اور دوسرے بعض جگہ انگریزی الفاظ بلا حواشی کے استعمال کرکے ان کے مطلب سمجھنے کا کام پڑھنے والوں پر چھوڑ دیا۔ ان دقتوں کو خود مترجم صاحب ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:-

"مقام غور و انصاف ہے کہ انگریزی زبان ایک بحر زخار اور دریائے ناپیدا کنار اور ہماری اردو زبان اس کے مقابل میں ایک کوزہ اور فن سیاست جدید ایک نرالا فن پس اس فن کی کتاب کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنا گویا لوہے کے چنے چبانا ہے اور ترجمہ بھی ایسا کہ اقل مراتب سمجھ میں تو آجائے۔"

اس سے بہت زیادہ صاف ترجمہ عربی کتاب "اقوم المسالک" کا ہے جو ۱۸۷۵ء میں مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے خلیفہ محمد حسن خاں صاحب وزیر اعظم ریاست پٹیالہ کی فرمائش پر کیا اور "احوال الممالک" نام رکھا۔ اس ترجمے کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:-

"لارڈ بروہم نے لکھا ہے کہ انگریزی طریقۂ انتظام سلطنت کی ترکیب میں ان جملہ امور کی رعایت کی گئی ہے جس سے کسی سلطنت کے اصول خالی نہیں ہوسکتے کیونکہ فی نفسہٖ سلطنت کی تین قسمیں ہیں۔ یا تو سلطنت شخصیہ جس کا مالک اور حکمراں شخص واحد ہو اور یا وہ سلطنت جس کے تمام اختیار بالکل ارا کین اور عمائد کے ہاتھ میں ہوں اور یا وہ سلطنت جس کے اصول حکمرانی عامہ رعایا کے ہاتھ میں ہوں"

اب بارہ برس آگے بڑھئے ۱۸۸۷ء میں سر سید احمد خاں مرحوم نے ایک لکچر لکھنؤ میں دیا جس کا عنوان یہ تھا کہ "ہماری قوم کو نسبت پولیٹیکل امور سلطنت کے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے" اور یہ لکچر در اصل مدراس کی انڈین نیشنل کانگریس کی سیاسی قراردادوں پر ایک تبصرہ تھا۔ ۱۸۸۷ء میں سیاسی زبان علاوہ اصطلاحات کے بالکل صاف ہوگئی ہے اور سر سید مرحوم کے سیاسی خیالات میں بھی ایک قسم کی پختگی نظر آنے لگی ہے۔ اب خود ان کے الفاظ سنئے۔

"سب سے پہلے یہ فرض کیجئے کہ وائسرائے کی کونسل اس قاعدے سے ہو جس کی خواہش ہے یعنی اس میں رعایا کے انتخاب سے ممبر مقرر ہوں اور انتخاب کی صورت یوں فرض کیجئے کہ تمام مسلمان ایک مسلمان کے ممبر ہونے کے لئے ووٹ دیں اور ایک ہندو کے لئے کل ہندو ووٹ دیں، اور گنئے کہ مسلمان کے لئے کتنے ووٹ ہوئے اور ہندو ممبر کے لئے کتنے۔ یقینی

ہندو ممبر کے چوگنے ووٹ ہونگے کیونکہ وہ آبادی میں مسلمانوں سے چوگنے ہیں۔ پس میتھی میٹکس کے ثبوت سے ایک ووٹ مسلمان ممبر کے لئے ہوگا اور چار ووٹ ہندو ممبر کے لئے۔ پس مسلمانوں کا ٹھکانا ہندوؤں کے مقابل کہاں رہے گا اور جوئے کے اصول کے مطابق چار پانسے ہندوؤں کے لئے اور ایک پانسہ ہمارے لئے ہوگا۔"

۱۸۸۸ء کی اس زبان اور تیس برس پہلے اسباب بغاوت ہند کی زبان کے درمیان زمین اور آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ صرف کسر یہ رہ گئی ہے کہ سیاسی اصطلاحات موجود نہیں اور ان کے نہ ہوتے ہوئے اس زمانے کے اردو ادیب نہایت آزادانہ طور پر انگریزی اصطلاحات استعمال کرنے میں مطلق کوئی عار نہیں سمجھتے تھے یہاں تک کہ مولانا حالیؔ نے اپنی تحریروں میں الفاظ لبرل، لبرٹی، نیشن وغیرہ کو نہایت بے باکانہ طریقے پر استعمال کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اصطلاحات کی تدوین کی ضرورت جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد ہی سے محسوس ہونی شروع ہوئی۔ جب جامعہ کے نصاب میں سیاسیات کا مضمون شامل ہوا اور بعض دقیق کتابوں کے تراجم کی ضرورت پیش آئی جن کے مؤلفین نے گویا بال کی کھال نکالی تھی تو ایک مجلس بطور خاص سیاسی اصطلاحات کو اردو کا جامہ پہنانے کے لئے بنائی گئی۔ اسی مجلس نے کم و بیش پانچ سو انگریزی سیاسی اصطلاحوں کا اردو میں ترجمہ کیا اور حقیقت میں اصلاح سازی کے میدان میں اسی نے پہل کی۔ اس کے ارکان میں نواب حیدر یار جنگ بہادر مرحوم

نواب سر مسعود جنگ مرحوم مولانا عمادی صاحب، جناب عنایت اللہ صاحب اور
بعض دوسرے اہل فکر کے نام آتے ہیں۔ اس کی بنائی ہوئی اصطلاحات میں سے
بہت سی ایسی ہیں جو اب ٹکسالی ہو گئی ہیں اور جنھوں نے اردو زبان میں مستقل جگہ
پیدا کرلی ہے، جیسے وفاقیہ یا وفاق، مقننہ، مجلس عاملہ، امور مفوضہ، امور منتقلہ، تقسیم
اختیارات، قلمرو، سیاسی فریق بندی، کابینہ، اقتدار اعلیٰ، آمر اور آمریت
مزاج، ولندستان، پولستان وغیرہ، نیز اسے بعض اصطلاحات کے مفہوم کا قطعی
فرق بتانا پڑا، جیسے عمومیت اور جمہوریت کے درمیان۔ غرض اس مجلس نے سیاسیات
کے میدان میں اردو کی بڑی خدمت کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ
دہلی سے اخبار "ہمدرد" بڑی آب و تاب سے نکال رہے تھے، بلکہ ہندوستان کے
طول و عرض میں مشکل سے کوئی ایسا اخبار ہوگا جو اس کے پایہ کا ہو۔ ایک صحبت میں
مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ بھائی تم اپنے یہاں کی بنائی ہوئی اصطلاحیں ہمیں کیوں نہیں
دیتے۔ یہ تو میں نے ان سے کہا نہیں کہ ہمارے دارالترجمہ کا وطیرہ یہ ہے کہ خاموش
علمی خدمت کرے، اور کسی قسم کی تشہیر اس کے پاس بھی نہیں پھٹکنی چاہیے اس کا کام
بے کار ہی کیوں نہ ہو جائے، بلکہ میں نے ایک فہرست ایسی اصطلاحات کی جو
اخباری دنیا میں کار آمد ہوں انھیں بھیج دی، اور مرحوم نے فوراً انھیں اپنے وقیع
اخبار میں جگہ دینی شروع کر دی، چنانچہ ہماری بعض سیاسی اصطلاحات کو جو مقبولیت
حاصل ہوئی ہے، ہم اس کے لئے "ہمدرد" کے مرہون منت ہیں۔

لیکن ابتدائی جوش میں جامعۂ عثمانیہ کی مجلس نے جو الفاظ بنائے ان میں سے
بہت سے ایسے تھے جو ذرا مشکل تھے اور ان میں ضرورت سے زیادہ عربیت ہونے کی

وجہ سے وہی نقص تھا جو سیاسی کتابوں کے ابتدائی ترجموں میں نظر آتا ہے، چنانچہ رفتہ رفتہ یہ محسوس ہونے لگا کہ اصطلاحات کی فہرست پر نظرثانی کی ضرورت ہے حسن اتفاق سے ڈاکٹر سید محمود صاحب وزیر تعلیمات بہار نے ایک کمیٹی اس غرض سے بنائی کہ ایسی اصطلاحات وضع کی جاتی جو اردو اور ہندی دونوں میں مشترک طور پر استعمال ہو سکیں اور اس کے رکن ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بھی بنے۔ ان کے اشارے پر یہاں حیدر آباد میں چند اساتذہ نے اصطلاحات کو سہل کرنے کا کام شروع کیا جو برابر دو یا ڈھائی مہینے تک جاری رہا اور اس نے تمام پرانی اصطلاحات پر نظرثانی کے ساتھ ساتھ نئی اصطلاحیں بھی بنائیں۔ مثال کی طور پر اساتذہ کی اس مجلس نے

Oligarchy کے لئے بجائے عدیدیت کے چندسری راج،

Referendum کے لئے بجائے مراجعہ کے فیصلہ طلبی،

Theocracy کے لئے بجائے حکومت الٰہیہ کے دین راج،

Aristocracy کے لئے بجائے اعیانیت کے امیرسری مقرر کئے، اور

بعض انگریزی الفاظ، مثلاً پارلیمنٹ، پارٹی، لبرل، جوڈیشل کمیٹی، بشپ وغیرہ ویسے کے ویسے ہی رہنے دئے۔ اس وقت ہمارے پاس سیاسیات کی کم و بیش ایک ہزار اصطلاحات موجود ہیں اور میں نے سہولت کی خاطر ان سب کو اپنی کتاب مبادی سیاسیات کی دوسری اشاعت میں ضمیمہ کی طور پر چھپوا دیا ہے

غرض یہ ہے کہ اس وقت علم سیاسیات پر اردو انشا پردازوں کے لئے بہت کافی مسالہ موجود ہے اور الفاظ اختراع کرنے کا ایک خاص اسلوب پیدا ہو گیا ہے جس سے باریک سے باریک نئی اصطلاحات بنانا تقریباً اتنا ہی آسان ہو گیا ہے جتنا یوروپی زبانوں میں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کام میں ان کے

زمانے میں جامعۂ عثمانیہ میں بڑی محنت کی گئی لیکن اولیت کا سہرا اسی پیر مرد کے سر ہے جس نے غدر کے طوفان خیز زمانے کے بعد ہی رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھا تھا۔

چین

(۱۸ر نومبر ۱۹۴۱ء)

دو سال ہوئے اسی نشرگاہ سے میں نے ایک تقریر چینی تمدن پر نشر کی تھی جس میں دکھایا تھا کہ یہ تمدن نہ صرف ایشیا کا شاندار قدیم ترین تمدن ہے بلکہ تمام دنیا کے تمدنوں کی صف اول میں اس کا شمار ہو سکتا ہے اور یورپ کی تہذیبوں سے تو یہ ہزاروں سال پرانا ہے۔ آج کی صحبت میں اس کی موجودہ حیثیت کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جائے گا۔

یوں تو بیرونی اقوام کا اس ملک میں صدیوں سے نفوذ ہو رہا تھا اور تجارت و تبلیغ کے بہانے چین پر وہ اپنا اثر مدتوں سے قائم کر رہی تھیں لیکن زمانہ حال میں شاید سب سے پہلی مرتبہ باضابطہ جنگ میں اس عظیم الشان ملک کو ۱۸۹۵ء میں نیچا دکھانا پڑا اور وہ بھی اس چھوٹے سے جزیرے والوں کے ہاتھوں جس کی تہذیب و تمدن یہاں تک کہ رسم خط اور زبان بھی ایک بڑی حد تک

چین کی رہین منت تھی۔ ۱۸۹۵ء کی جنگ چین و جاپان کا نتیجہ ایک تو یہ نکلا کہ جاپان نے جنوب کی شاہ راہ دیکھ لی اور چینی جزیرۂ فارموزا پر قبضہ کرلیا؛ دوسرے جاپان کو پہلی مرتبہ زمانۂ جدید کی جنگ کا مزہ ملا اور اس لئے یہ بھانپ لیا کہ وہ نئے اسلحہ اور نئے طریقوں سے کیسے ایک عظیم الشان ملک کو نیچا دکھا سکتا ہے۔ چین کی تاریخ میں اس کے پانچ سال بعد کا واقعہ جسے گھونسہ بازوں کی شورش کہتے ہیں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ نام نہاد شورش اصل میں یوروپی اثر اور یوروپی نفوذ کے خلاف ایک بڑی تحریک کا نتیجہ تھی، لیکن اس تحریک کو سخت ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا اور اس وقت سے لے کر ۱۹۱۱ء تک کی تاریخ چین کے پے در پے زوال کی تاریخ سمجھنی چاہئے۔

۱۹۰۵ء میں وہ جنگ ہوئی جس میں زمانۂ حال میں پہلی مرتبہ بونے، کم رو جاپانیوں نے عظیم الجثہ، زبردست، روسیوں کو شکست دی اور اس طرح مشرق کے سامنے یہ تخیل قائم کیا کہ ایشیائی آج کل کے زمانے میں بھی یوروپیوں کے ہتھیار لے کر لڑ سکتے ہیں اور انھیں نیچا دکھا سکتے ہیں۔ روس کو ہزیمت اٹھانی پڑی، اور چین کے ان صوبوں میں جو سلطنت روس سے قریب تر تھے، یعنی منچوریا میں روس کی جگہ جاپان نے لی۔ اس فتح سے جاپان کی طاقت اتنی مرعوب کن ہوگئی کہ پانچ برس بعد، یعنی ۱۹۱۰ء میں، اس نے کوریا پر بغیر ایک گولی چلائے قبضہ کرلیا۔ ۱۹۰۵ء میں جزیرہ نمائے لیاؤٹنگ کے شہر پورٹ آرتھر پر قبضہ کرکے اس نے اپنے لئے گویا چین کا دروازہ کھول لیا تھا؛ اب کوریا کا نہ صرف الحاق کرلیا گیا بلکہ اسے جاپان کا ایک جزو بنا لیا گیا اور اس طرح جاپان اب ایک ایشیائی اور براعظمی سلطنت

بن گیا۔ ۱۹۱۴ء کی عالمی جنگ میں جاپان ابتدا ہی سے جرمنی کے خلاف شریک ہوگیا اور اسے اپنے حریف کو بندرگاہ کیاؤ چاؤ سے نکال دینے میں کسی وقت کا سامنا کرنا نہیں پڑا، چنانچہ وہ اب ایک حد تک اس سمندر کا مالک بن گیا جسے بحیرہ زرد کہتے ہیں۔

الغرض بیچارے چین کا گلا گھونٹنے کی پہلے دن سے کوششیں کی جا رہی تھیں ایک طرف تو دول یورپ اس میں داخل ہو کر اسے زچ کر رہے تھے اور دوسری جانب جاپان فارموزا پر قبضہ کرنے کے بعد جنوب کی طرف بڑھنے کے ابھی سے خواب دیکھ رہا تھا، اور کوریا لینے کے بعد یہ سوچ رہا تھا کہ چین میں گھس جانا ایسا دشوار نہیں جیسا نظر آتا ہے، بشرطیکہ دول یورپ سدراہ نہ بن جائیں۔ گھونسہ بازوں کی شورش میں تو اس نے دول یورپ سے مل کر کام کرنا چاہا تھا، لیکن روس کے ساتھ جنگ کے بعد پینترا بدل کر اس نے اپنے آپ کو ایشیائیوں کے حقوق کا محافظ بنا لیا۔ لیکن چینی اس فریب میں آنے والے نہ تھے اور اس سے دلی نفرت کرتے تھے جب میں ۱۹۰۸ء اور اس کے قریب کے زمانے میں یعنی جنگ روس و جاپان سے تین چار ہی بعد، انگلستان میں زیر تعلیم تھا، تو وہاں اتفاقاً کئی چینیوں سے دوستی ہوگئی جن میں سے ایک مشہور چینی مدبر اور ملکہ تسوہسی کے دست راست لی ہنگ چینگ کے پوتے بھی تھے۔ مجھے نہایت تعجب ہوا کرتا تھا کہ چینی کیوں ایسی سلطنت کے دشمن ہیں جس نے چالیس برس کے قلیل عرصے میں قدامت پسندی کا چولا اتار کر پھینک دیا ہے اور جو دول عالم کی صف اول میں آ گیا ہے۔ اُن دنوں میں اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتا تھا کہ چین کے خلاف جو محاذ قائم ہے اس کا شاید سب سے

ممتاز رکن جاپان ہی ہے، اور باوجود اس ادعا کے کہ یوروپی نفوذ کی مخالفت ضروری ہے، انگریزوں، فرانسیسیوں، جرمنوں، آسٹریوں، ولندیزیوں، روسیوں کے ساتھ وہ بھی بیچارے چین کے ساتھ طرح طرح کی مراعات اینٹھنے اور ٹھیکے مانگنے میں کسی سے پیچھے نہیں۔ اصل میں وہ ایسے موقع کی فکر میں تھا کہ یا تو چین کی بظاہر بے جان لاش سے یوروپیوں کی توجہ ہٹے ورنہ پھر ان میں آپس میں جوتا چل جائے تو چین کو نیچا دکھانا دشوار نہ ہوگا - یہ موقع اسے ۱۹۱۴ء کی عالمی جنگ چھڑتے ہی مل گیا اور اس جنگ کی ابتداء کو کچھ ہی مہینے گذرے ہونگے کہ اس نے چین کے سامنے وہ مشہور و معروف اکیس مطالبے پیش کئے جو منظور ہو جاتے تو چین کلیتاً اس کا ماتحت بن جاتا۔ گو یوروپی دول باہم برسرپیکار تھے لیکن انھوں نے اس لئے نہیں کہ انھیں چین سے کوئی خاص ہمدردی تھی، بلکہ زیادہ تر اس لئے کہ چین جاپان کے چنگل میں پھنس گیا تو ان کے لئے کیا رہے گا، صاف صاف جاپان سے کہہ دیا کہ وہ کسی حالت میں چین کو اس کے قبضے میں نہ جانے دیں گے۔

اسی زمانے میں چین میں بہت سے ایسے محب وطن پیدا ہو رہے تھے جو اس ملک میں از سر نو زندگی پیدا کرنے کے درپئے تھے۔ ۱۹۱۱ء کے انقلاب کے بعد چینیوں میں ایسے نام سننے میں آتے ہیں جیسے سن یاتسن اور یوان شی کائی جنھوں نے ملک میں ایک وحدت پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس کے تفرقوں کو اپنی اخلاقی قوت اور فوجی زور سے مٹانا چاہا۔ زمانۂ حال میں سن یاتسن کا نام چین کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے اس لئے کہ اسی نے توہم پرستی کے پرانے مرکز پیکنگ کی بجائے جنوبی شہر نانکنگ کو مستقر جمہوریہ بنایا اور یہاں سے

تمام مرکز گریز ریشہ دوانیوں کا خاتمہ کرنا شروع کردیا۔ اس نے محسوس کیا کہ چین واقعی متحد ہو جائے اور اپنا استبدادی چولا اتار کر پھینک دے تو وہ بہت جلد دوسروں کے جوئے سے بھی آزاد ہو جائے گا خواہ وہ یوروپی تدبر اور معاشی ترکیبوں کا جوا ہو یا جاپان کی قوت کا جوا۔ اسے اس کا احساس تھا کہ چین اور اس کے ماتحت علاقوں کے پچاس کروڑ باشندے، جن کے ملک کی کانوں میں پتھر کا کوئلہ اتنا ہے کہ کسی دوسرے ملک میں نہیں، جس کا مرکزی رقبہ لوہے سے بھرا ہوا ہے، جہاں تانبا، چاندی اور ٹین کی بہتات ہے، جسے خدا نے زرخیز علاقے اور لاکھوں مربع میل کی چراگاہیں دی ہیں، اگر ایسے ملک کی تنظیم کی جائے تو وہ کسی دوسرے سے پیچھے نہیں رہ سکتا۔ لیکن سن یاٹسن کا ۱۹۲۵ء میں انتقال ہوگیا اور اس کی موت پر ملک میں وہ خانہ جنگی شروع ہوئی جو اس وقت تک برابر جاری رہی جب تک مارشل چیانگ کائی شک نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں نہ لے لی اور اپنے ملک والوں کے دل و دماغ میں وہ توانائی پیدا نہ کی جو اس ملک کی تاریخ میں صدیوں سے ناپید تھی۔ سن نے اپنے زمانے میں ایک ایسا کام کیا تھا جس سے چین کی خودداری کئی گنا بڑھ گئی، یعنی جب اس نے دیکھا کہ دول یورپ جاپان کا ساتھ دے رہے ہیں تو اس نے ۱۹۲۱ء میں جرمنی سے، جو شکست خوردہ سہی، ایک سفید فام یوروپی قوم ضرور تھی، ایک بالکل مساویانہ عہدنامہ کیا جو ان تمام عہدناموں سے بالکل مختلف تھا جو اسے پچھلے سوا سو برس میں دوسرے دول سے کرنے پڑے تھے اور جن کی بنا پر کہیں تو اسے کسی بندرگاہ کا ننانوے برس کا ٹھیکہ دینا پڑا تھا، کہیں اپنی آمدنی کی کوئی مد تمام و کمال اغیار کے سپرد کرنی پڑی تھی، کہیں کسی بڑے

شہر مثلاً شنگھائی یا کینٹن کے محلوں کو دوسروں کے قبضے میں دینا پڑا تھا۔ اس طرح نئے چین نے ایک طرف جاپان کو، دوسری جانب یورپ والوں کو یہ دکھا دیا کہ اب اس نے ایک نیا جامہ پہنا ہے اور وہ آیندہ کسی کا زیر دست بننے کے لئے تیار نہیں ہے۔

سن کے مرنے کے بعد چین میں بڑی افراتفری پھیلی اور شمال اور جنوب کے درمیان ایک بظاہر ناقابل اختتام جنگ چھڑ گئی۔ لیکن پہلے ہی دن سے ملک کے نئے مستقر نانکنگ کو آہستہ آہستہ کامیابیاں ہونے لگیں، اور آخر ۱۹۲۹ء میں شمالی حکومت کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔ اب جنوبی حکومت کو دول یورپ نے چین کی واقعی اور جائز حکومت تسلیم کرلیا اور رفتہ رفتہ انھیں بھی اس کا احساس ہونے لگا کہ نئے چین سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنا ہی ان کے لئے بہتر ہے، چنانچہ آیندہ حکمت عملی کی ضمانت کے طور پر انگریزوں نے وہ تمام اختیارات جو انھیں بعض شہروں مثلاً ہنکاؤ میں حاصل تھے، چینیوں کو واپس کردئے۔

یہ زمانہ بین اقوامی معاملات میں نہایت درجہ رجائیت کا زمانہ تھا۔ انجمن اقوام ممکن تھی کہ اس کے پاس تہدیدوں کا جو آلۂ کار ہے اس کے باعث آیندہ کبھی کوئی جنگ نہیں ہوگی اس لئے کہ اگر کوئی ملک جنگ میں پہل کرنا چاہے گا تو معاشی مقاطعہ کی محض دھمکی سے اسے باز رکھا جاسکے گا۔ بلاشبہ اس انجمن میں امریکہ اور شکست خوردہ سلطنتیں شامل نہیں تھیں، لیکن ۱۹۲۱ء کے عہد نامہ جات واشنگٹن کی رو سے دوسرے دول کے ساتھ امریکہ اور جاپان نے بھی چین کی آزادی کو برقرار رکھنے کا وعدہ کرلیا تھا۔ اس کے علاوہ ۱۹۲۸ء میں اس مشہور عہد نامہ پر دستخط کئے گئے جسے تہ نامۂ

کیلاگ کہتے ہیں اور جس کے ذریعے سے دنیا کی ساٹھ سلطنتوں نے، جن میں چین، جاپان، امریکہ، جرمنی سب ہی تھے، یہ طے کیا کہ ان میں سے کوئی کبھی بھی کسی بین اقوامی معاملے کو جنگ کا بہانہ نہیں بنائے گا اور نہ اپنے ہمسائے پر کسی بین اقوامی الجھاؤ کو سلجھانے کے لئے کوئی حملہ کرے گا۔ میری اس تقریر کے بہت سے سننے والوں کو اس کا علم ہوگا کہ جاپان ۱۹۳۱ء سے جو چین کا گلا گھونٹنے کی کوشش کر رہا ہے تو اسے جاپانی "جنگ" نہیں کہتے بلکہ صرف ایک "حادثہ" یا "معاملہ" کہتے ہیں۔ اس میں ایک لطیفہ مضمر ہے اور اس لطیفے سے زمانۂ حال کے بین اقوامی معاملات میں بعض دول کی انتہائی فریب کاری کا پتہ چلتا ہے۔ چونکہ عہد نامۂ کیلاگ پر جاپان کے دستخط بھی ہیں اس لئے جاپانی کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے عزیز ہمسائے کے خلاف کبھی اعلان جنگ نہیں کیا اور حقیقت میں ہم اور چینی سرے سے برسر جنگ ہیں ہی نہیں، بلکہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے محض ایک افسوسناک واقعہ ہے۔ وہی قصہ کہ

ہماری جان گئی، آپ کی ادا ٹھیری

یہاں سیکڑوں مربع میل کچل گئے، کروڑوں بے گناہ مرد، عورتیں، بچے موت کے گھاٹ اتار دئے گئے، بیسیوں گاؤں اور شہر جلا کر خاکستر کر دئے گئے، اور جاپان مطمئن ہے کہ ابھی تک وہ عہد نامۂ کیلاگ کی لفظاً اور معناً پابندی کر رہا ہے اور ابھی تک اس نے اپنے دوست چین کے خلاف اعلان جنگ نہیں کیا!

بہرحال جس زمانے میں بظاہر چین کی ساعت نیک معلوم ہوتی تھی، جب دول یورپ بظاہر اجتماعی حفاظت کے اصول پر عمل کرنے لگے تھے، جب تمام عناصر چین کے روشن مستقبل کی گویا ضمانت دے رہے تھے، یہ دیکھ کر کہ عالمی کساد بازاری

کی وجہ سے باقی ماندہ دنیا کا گویا دیوالہ نکل رہا ہے، جاپان ایک معمولی بہانے پر منچوریا پر حملہ کر دیتا ہے، اور جو جنگ اس وقت ٹھنتی ہے وہ تھوڑے بہت وقفے سے اس وقت تک جاری ہے۔ منچوریا پر حملہ اس نظام نامہ پر ایک کاری ضرب تھی جو انجمن اقوام کے ساتھ وابستہ سمجھا جاتا تھا، لیکن اس کے باوجود بھی انجمن کا کوئی رکن جاپان سے لڑائی مول لینا نہیں چاہتا تھا، اور جاپان کا کسی قسم کا مقاطعہ کرنے کی بجائے صرف یہ کیا گیا کہ ایک کمیشن منچوریا روانہ کی گئی جس نے موقع پر پہونچ کر خوب چھان بین کی اور ایک ضخیم روداد مرتب کی جس میں جاپان کو ملزم قرار دیا گیا۔ اس رپورٹ کے مدنظر جاپان کو توبہ کرنے کے لئے چھ ہفتے دیے گئے لیکن ان چھ ہفتوں میں جاپان نے آگے بڑھ کر ایک اور صوبہ جیہول بھی فتح کر لیا، اور چند مزید ہفتوں کے بعد مسٹر پویی کو نئی سلطنت منچوکنو کا شہنشاہ بنا دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ انجمن اقوام کے زوال کی تاریخ میں سب سے پہلا واقعہ منچوریا کی فتح ہے اس لئے کہ اس کا ایک رکن دوسرے رکن پر حملہ کرتا ہے اور انجمن سوائے کمیٹیاں اور کمیشنیں مقرر کرنے کے کوئی عملی راستہ اختیار نہیں کرتی اور اس طرح اپنی بے چارگی کا پہلا ثبوت دیتی ہے۔

اس کے بعد کے حالات بالکل حال کی تاریخ ہے۔ ۱۹۳۴ء کے اوائل میں مسٹر ہیروٹا وزیر خارجہ جاپان نے یہ کہہ کر تمام دنیا کو انگشت بدنداں کر دیا کہ براعظم ایشیا میں عموماً اور چین میں خصوصاً اس ملک کی بڑی بڑی ذمہ داریاں ہیں، اور اگر کسی تیسرے ملک نے کسی طرح کی فنی یا مالی مدد چین کی کی تو اس مدد کی اہمیت سیاسی تصور کی جائے گی اور یہ جاپان کے مفاد کے عین خلاف ہوگا۔ اگلے سال جاپان انجمن

اقوام سے علیحدہ ہو گیا اور اسی سال کے آخر میں اس نے واشنگٹن کے عہد نامے کی تنسیخ کا اعلان بھی کر دیا۔ چین کے "معاملے" کے متعلق جاپان کے سامنے ایک دوراہہ تھا، یا تو وہ چین کو ہر طرح کی مدد دے کر اپنا بنا لیتا اور ان تمام کدورتوں کو دور کر دیتا جو چین میں اس کے خلاف پیدا ہو گئی تھیں، ورنہ از سر نو جنگ ٹھان کر چین کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتا۔ اس لئے دوسرا رویّہ اختیار کیا اور چین پر وار کر دیا۔

اب گویا ایک معجزہ ظہور میں آتا ہے۔ ایسا معجزہ جس سے دنیا کی تاریخ بھری پڑی ہے اور جسے ہم انسانی کوششوں سے ماوراء سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

کے مصداق ایک شخص چیانگ کائی شک اٹھتا ہے اور وہ کرتا ہے جو چین میں مشکل سے کبھی ہوا ہو گا یعنی اس کی للکار پر تمام چین جاپانیوں کی مدافعت پر متحد ہو جاتا ہے۔ آج کئی سال ہو گئے ہیں اور باوجود بے انتہا جانی مالی نقصان کے اور باوجود ابتدا میں ایک کم و بیش نہتے ہونے کے چین اب بھی آزاد ہے اور اس آزادی میں تمام منصف مزاج اقوام عالم کی دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔ جاپان نے چین کے مشرقی حصے پر قبضہ کر لیا ہو، وہ ہند چینی کے ذریعے سے اس بہادر ملک کے چاروں طرف حصار کھینچ رہا ہو، اس کے پاس برما کی سڑک کو غارت کرنے کے لئے بے پناہ ہوائی طاقت ہو، لیکن چین کی روح اب پہلے سے بھی زیادہ مضطرب ہے، اور ہر چینی محب وطن کو یقین ہے کہ کبھی نہ کبھی مصیبت کے دن ختم ہوں گے اور جاپانیوں کو اپنے جزیرے میں واپس جانا پڑے گا۔

ہندوستان کے موجودہ مسائل

(۲۸ر فروری ۱۹۴۲ء)

ایسے ملک کے مسائل جس میں شاید چین کے علاوہ دنیا کے تمام ملکوں سے زیادہ آبادی ہو اور جس کی تاریخ بعض کے خیال کے بموجب لاکھوں برس اور بعض کے نزدیک کم از کم پانچ چھ ہزار سال قدیم ہو، جس میں قطب شمال کا سا جاڑا اور خط استوا کی سی گرمی پائی جاتی ہو، جس میں خدا کی دی ہوئی زرخیزی، سونے، لوہے، کوئلے اور نہ جانے کتنی طرح کی دھاتیں پائی جاتی ہوں، جس میں بقول لارڈ مورلے آنجہانی کے چودھویں صدی عیسوی سے لے کر آج کل کے جدید ترین تمدن سب ہی کے قائم مقام پائے جاتے ہوں، جس کی بولیاں، تہذیبیں اور تمدن نہ جانے کتنوں کو متحیر کر چکے ہوں ایسے ملک کے مسائل کا کیا کہنا۔ اگر کوئی دوسرا مسئلہ نہ بھی ہوتا، صرف چالیس کروڑ باشندے ایک ملک میں رہتے ہوتے تو بھی اس کا انتظام ایک نہایت دشوار مسئلہ تھا، اور جہاں اس کے علاوہ یہ سب کچھ بھی ہو تو بھی مسائل کا تنوع عقلوں کو گم کرنے کے لئے کافی ہوگا۔ پھر حکم یہ ہے کہ ان مسائل کا کم از کم شمار ہی پندرہ منٹ میں کر دیا جائے۔

یقیناً سامعین کرام کو میرے ساتھ ہمدردی ہوگی۔

اس وقت جو مسئلہ سب سے اہم معلوم ہوتا ہے وہ ہندوستان کے بچاؤ کا مسئلہ ہے۔ جرمنی اور سلطنت برطانیہ کی جنگ شروع ہوئے دو سال سے زیادہ ہوئے۔ ابتک ہم شاید اسے ایک بڑا تماشہ سمجھے ہوئے تھے۔ آرام کرسی پر بیٹھ کر نہایت دلچسپی سے یورپ والوں کی مڈبھیڑ کی خبریں پڑھتے تھے اور ان پر تبصرہ کرتے تھے، ان سے محظوظ ہوتے تھے، کبھی جرمنی کی تنظیم اور کبھی اٹلی والوں کی بزدلی پر تبادلہ خیالات کرتے تھے، کبھی ہٹلر کی سخت گیریوں اور اپنے ملک کو مسحور کر لینے پر انگشت بدنداں ہوتے تھے، کبھی سوچتے تھے کہ اس جنگ کا نتیجہ یورپ والوں کے حق میں کیا ہوتا ہے، ان تمام باتوں کا ہم میں سے اکثر کی طبیعتوں پر جو اثر پڑتا تھا وہ کچھ اس طرح کا جیسے کسی تماشے کا پڑتا ہے۔ یورپ میں یا افریقہ میں کچھ ہو رہا ہو، بیشتر ہندوستانی سمجھتے تھے کہ کم از کم ہم تو اپنے ملک میں آرام کی نیند سوتے ہیں اور آرام سے بیدار ہوتے ہیں۔ چین و جاپان کی لڑائی سالوں سے جاری تھی مگر وہ بھی ہمارے لئے بس ایک تماشا تھی، کوئی چینی قوم کو پست کہہ کر رائے زنی کرتا تھا کہ وہ اس کے مستحق ہیں جو ان کے سر پر آپڑا ہے، کوئی جاپان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا کہ اس نے ایک کمزور کی پیٹھ میں چھرا بھونکنے کی کوشش کی، ایک تیسرا متحیر تھا کہ آخر چین کیسے ایک عظیم الشان فوجی کل کا سالہا سال سے مقابلہ کر رہا ہے۔ ایک روز ہندوستان انگڑائی لے کر جو اٹھا تو کیا دیکھتا ہے کہ جسے وہ تماشا سمجھتا تھا وہ تماشا نہیں محض تصویریں نہیں، بلکہ سچ مچ کے انسان ہیں انھیں میں سے ایک نے بعض تماشہ بینوں سے سازش کر کے پہلی صف والوں پر حملہ کر دیا ہے،

اور اس کے بعد ایک آبدار خنجر ہاتھ میں لئے ہوئے خود ہندوستان پر، جو دوسری صف میں ہے، وار کر رہا ہے۔

ہندوستان کی فوجیں ایک طرف طرابلس میں دوسری طرف ملایا اور برما میں براہ راست یورپی اور ایشیائی دشمن سے دست و گریباں ہیں اور ہمارے ملک کے بے شمار گھرانے اپنے بھائیوں، بیٹوں، باپوں کی جانوں کی خیر ہی نہیں منا رہے بلکہ جن مقاصد کے لئے وہ نبرد آزما ہیں ان کے لئے بھی دست بدعا ہیں۔ ہندوستان کو اب کیا چاہیئے؟ یہی کہ آگے بڑھ کر دشمن پر حملہ نہ کر سکے تو کم از کم اپنے بچاؤ کا پورا انتظام کرے، اپنی قوت مجتمع کرے، گھر پر ڈاکو کا وار ہے تو گھر والے اپنے پرانے جھگڑوں، ٹنٹوں کو بھول جائیں اور یک جان و یک قالب ہو کر جو تھوڑا بہت ہے اسے محفوظ کر لیں۔ جیسے اوپر کہا گیا ہے بظاہر اس وقت سب سے اہم مسئلہ ہے جو ہندوستان کے سامنے ہے۔

لیکن اس مسئلے کی تہہ میں بہت سے دوسرے مسائل ہیں۔ کیا ہندوستان کے پاس قوت ہے اور نہیں ہے تو کیوں نہیں؟ پھر جو کچھ بھی قوت ہے کیا ہندوستان اسے مجتمع کر رہا ہے اور نہیں کر رہا ہے تو کیوں نہیں۔ تیسرے جو نقائص ہم میں پائے جاتے ہیں ان کے اسباب آخر کیا ہیں حقیقت یہ ہے کہ محض تقاریر، مضامین اور تشہیر سے کچھ نہیں ہو سکتا، اگر جو مواد ہمارے پاس ہے وہی بیکار ہو اور جو سکے ہم چلانا چاہتے ہوں وہ کھوٹے ہوں۔

ہندوستان کے دیرینہ مسائل کو ذرا پہلے سے دیکھنا پڑے گا۔ پہلے تو ہندوستان کی قوت کو لیجیئے۔ اوپر سرسری طور پر دکھایا گیا ہے کہ خدا نے ہمیں دنیا کے

زرخیز ترین خطوں میں سے ایک ودیعت کیا ہے، اور یہ زرخیزی نہ صرف کاشتکاری کی حد تک ہے بلکہ ہمارے ملک میں مختلف قسم کی خام پیداوار کی اس قدر کثرت ہے کہ مشکل سے کوئی دوسرا ملک اس کا مد مقابل بن سکتا ہے۔ لیکن کیفیت کیا ہے؟ ہماری خام پیداوار دوسرے ملکوں کی صنعتی ترقی کے لئے وقف ہے۔ ہمارے یہاں روئی اس لئے پیدا کی جاتی ہے کہ اس کی گٹھریاں بنا بنا کر یورپ اور جاپان بھیجی جائیں اور یہاں سے تومنوں کے حساب سے جائے وہاں سے کپڑوں کی شکل میں تولوں کے حساب سے ہمارے ہاتھ فروخت کی جائے۔ ہمارے یہاں پچاس ساٹھ برس سے اناج کی قیمت روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور غربا کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے لیکن اناج کی برآمد بند نہیں ہوتی۔ ہندوستان کی جڑی بوٹیاں باہر جاتی ہیں اور وہاں سے ٹنکچروں اور ادویات کی شکل میں واپس آتی ہیں، چنانچہ ایک مخصوص طرز علاج کی ترویج سے بجائے اس کے کہ یہ نتیجہ نکلے کہ خود ہمارے ملک کی ہی صنعت کو فروغ ہو، نہ صرف پیٹنٹ ادویہ کی شکل میں بلکہ مفردات کی شکل میں بھی ملک کا کروڑوں روپیہ باہر چلا جا رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ موجودہ جنگ کے دوران میں ہندوستان کی صنعت وحرفت کو ترقی دی جا رہی ہے، لیکن بعض کا خیال ہے کہ جو ہو رہا ہے محض مجبوراً ہو رہا ہے اور جنگ کے بعد جب راستے کھل جائیں گے تو ہماری صنعتی پستی پھر عود کر آئے گی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ کیوں ہے اور ہم صنعتی اعتبار سے دنیا کے ملکوں کی صف آخر میں کیوں ہیں؟ اگر غور کیا جائے تو یہ سب پستی خود ہمارے کردار کا اور ہمارے غلط تعلیمی نصاب کا نتیجہ ہے۔ مجھے میرے سائنس دان دوست معاف

کریں گے کہ زیادہ تر یہ اس نصاب کا نتیجہ ہے جس کے تحت سائنس جیسی عملی چیز بھی ایک بڑی حد تک نظری طور پر آج سے نہیں بلکہ ان گنت سالوں سے پڑھائی جاتی ہے، اور بجائے اس کے کہ اس کی تعلیم میں ملک کی مخصوص ضروریات اور انھیں پورا کرنے کے طریقے سکھائے جائیں، عام طور پر وہی نصاب رکھا جاتا ہے جو فرض کیجئے لندن، آکسفرڈ اور کیمبرج کا نصاب ہے۔ ہمیں شبہ نہیں کہ اب اس طرز کے خلاف ایک ردعمل شروع ہوا ہے اول تو یہ اس وقت ہوا ہے جب پانی سر سے اونچا آگیا تھا اور دوسرے کون جانے کہ جنگ کے بعد بنی بنائی چیزیں دوبارہ باہر سے آنے لگیں گی تو پھر ہم لکیر کے فقیر بن کر نہیں رہ جائیں گے۔

اسی سلسلے میں ایک دوسری بات پر بھی غور ضروری ہے۔ ہمارے کالجوں میں باربار یہ آواز پڑتی ہے کہ یہ ملک ایک زراعتی ملک ہے اور نہ صرف یہاں کے نوے فیصدی لوگوں کا پیشہ زراعت ہے بلکہ ایسا ہی رہنا چاہیے۔ کوئی شبہ نہیں کہ زراعت ایک نہایت ضروری چیز ہے اور پچھلی جنگ عظیم اور موجودہ جنگ دونوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ملک میں کم از کم اتنی پیداوار ہونا ضروری ہے جس سے ملک والے پل سکیں۔ لیکن معاشیات ہند کا یہ مسئلہ اب پیش پا افتادہ سا ہوگیا ہے اسلئے کہ موجودہ حالات میں کاشتکار اپنا پیٹ مشکل سے پال سکتا ہے، اور اگر ہر ایک شخص کاشتکار بن جائے تو ملک بجائے دولتمند ہونے کے روز بروز مفلس ہوتا جائے گا۔ ملک کی مالی حالت استوار کرنے کا اگر کوئی طریقہ ہے تو یہی کہ کاشتکاری کو محدود کیا جائے اور ہمارے کلیات اور جامعات میں سائنس کی تعلیم شروع ہی سے ایسی دی جائے کہ نصاب میں بہ طور خاص اس حصہ ملک کی خام پیداوار سے کام نکالنے کے طریقے بتائے جائیں جہاں وہ جامعہ یا کلیہ موجود

نظریات کی تعلیم بہت اچھی ہے لیکن نام نہاد عملی تعلیم میں جب تک مقامی کیفیات کا لحاظ نہ رکھا جائے یہ تعلیم ادھوری رہ جاتی ہے اور اس کا افادی پہلو فنا ہو جاتا ہے اگر خام پیداوار کی قدر کو صنعتی طریقوں سے بڑھانا ہمارے بچوں کو ابتدا ہی سے سکھایا جانے لگا تو یقین ہے کہ ہماری معاشی پستی بہت جلد کم ہو جائے گی۔

یہ تو اب ایک مادّی مسئلہ ہوا۔ اب دوسری طرف جائیے۔ ہماری تمام تعلیم کے فطری رجحانات کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہماری ذہنی کیفیات بھی نظری ہو گئی ہیں تعلیم میں ہم اپنے بچوں کو یورپی نمونے پر یوروپی خیالات سکھاتے ہیں حالانکہ خیالات زیادہ تر ماحول کا نمونہ ہونے چاہئیں اور ایسے خیالات جو سب کے سب ماحول سے جدا ہوں سوائے اس کے کہ طبائع میں بے سود بے چینی پیدا کریں اور کچھ نتیجہ نہیں ہوتا۔ ہم یوروپیوں کی طرح کپڑا پہننا چاہتے ہیں لیکن کپڑا ایسا جو باہر کا بنا ہو، ہم ان کی طرح کھانا کھانا چاہتے ہیں لیکن برتن باہر کا بلکہ اگر کھانا یوروپی ہو تو مسالہ بھی باہر کا، ہم یوروپیوں کے سے خیالات رکھنا چاہتے ہیں لیکن ماحول کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہم نے اپنے آپ کو تمام آبادی سے بے گانہ کر لیا ہے ہم ایسے سبز باغ کا خواب دیکھتے ہیں جس میں حقیقت میں نہ سبزی ہے نہ باغ ہے بلکہ ویران سنسان جنگل ہے جس میں ہم تن تنہا کھڑے ہوئے ہوں۔ ایسی حالت میں کیا عجب ہے کہ ہماری ذہنیتیں ہمارے قابو سے باہر اور غیر حقیقی ہو گئی ہیں۔

ہم مذہب سے اس لئے بیگانہ ہوتے جاتے ہیں کہ یورپ والے مذہب سے بے گانہ ہیں، ہم اپنے ادبیات پر یوروپی ادبیات کو ترجیح دیتے ہیں اور شیکسپیر ملٹن، زولا اور چیخوف کے ناموں سے بہ نسبت اپنے سعدی، حافظ، حالی، اقبال،

بنکم چند پیٹرجی اور ایسے ہی بیسیوں اساتذہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کسی ٹاگور یا کسی رامن کی شہرت مغرب میں ہو گئی تو پھر ہم بھی محض نقالوں کی طرح اس کا کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔

سیاسیات میں یہ کیفیت اور بھی زیادہ نمایاں ہے۔ یہاں ہم اپنے حقیقی ماحول کو قطعاً نظر انداز کرنے کے لئے تیار ہیں صرف اس لئے کہ ہندوستانی ماحول یوروپی ماحول سے جدا گانہ ہے اور یوروپی ماحول ہی ہمیں معیاری نظر آتا ہے۔ ہم عمومیت عمومیت پکارتے ہیں اور یہ سمجھتے نہیں کہ عمومیت بہترین طرز حکومت سہی لیکن یہ محض ایک اصول ہے اور فروعات کا یورپ کے ہر ملک میں جداگانہ طور پر ارتقا ہوا ہے۔ پھر ہم یہیں نہیں رکتے بلکہ شاید اس وجہ سے کہ ہم یورپ کے ممالک میں سے صرف انگلستان سے واقف ہیں ہم عمومیت کے اس سانچے میں اپنے ملک کو ڈھالنا چاہتے ہیں جو بطور خاص انگلستان میں کارفرما ہے اور یہ بھول جاتے ہیں کہ انگلستان والوں نے عمومیت کا یہ خاص ڈھنگ ایک ہزار سال کی انتہائی جدوجہد کے بعد حاصل کیا ہے اور کسی ملک کی سیاست کبھی ایسی سیال نہیں ہوتی کہ جس قالب میں چاہا اسے ڈھال دیا۔ آخر عمومیت کی ایک شکل ممالک متحدہ امریکہ میں بھی تو ہے جہاں کا صدر مستقل طور پر کم سے کم چار سال کے لئے منتخب ہوتا ہے اور جس وزیر کو چاہے علیٰحدہ کر سکتا ہے دوسری شکل سوویتستان میں ہے جہاں کی کابینہ میں کسی ایک ضلع سے ایک سے زیادہ قائم مقام رکن نہیں ہوتے اور جس میں پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک دونوں مذہبوں کی نمائندگی لازمی ہے تیسری شکل کناڈا میں ہے جہاں کی پارلیمنٹ کے ایوانوں اور کابینہ میں بطور خاص

انگریز اور فرانسیسی دونوں قوموں کی تناسبی نیابت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ زبان کے اعتبار سے بھی عمومیت پسند ممالک میں ہمیشہ مفاہمت کی کیفیت رہی ہے۔ کناڈا میں انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانیں سرکاری زبانیں ہیں اور یہی کیفیت جنوبی افریقہ کی انگریزی اور ولندیزی زبانوں کی ہے۔ سوئیٹسان کے ہر ضلع میں خود ضلع کی اپنی زبان سرکاری زبان ہے لیکن مرکزی حکومت اور مرکزی پارلیمنٹ میں چار زبانیں مساوی طور پر تسلیم کی جاتی ہیں اور جملہ مرکزی قوانین چاروں زبانوں میں شائع ہوتے ہیں، حالانکہ جرمن زبان ملک کے ⅔ حصے میں بولی جاتی ہے اور اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ ہوتا تو جرمن کے علاوہ کسی زبان کو جگہ نہ ملتی۔

ہمارے ملک میں چونکہ سیاست پسند حضرات نے گویا اپنا ایک جداگانہ خیالی ملک بنالیا ہے اس لئے وہ یہاں کے حالات اور واقعات کی اصلیت سے بالکل گریز کرکے غالیت کی طرف چلے جاتے ہیں اور طرح طرح کے نظرئے قائم کرتے ہیں جو انھیں اصل سے دور لئے جارہے ہیں۔ کوئی صاحب تو ایسے نکلتے ہیں جو باوجود تنوعات کے ہندوستان کو ایک ایسا ملک سمجھتے جس میں مختلف صوبوں، مذہبوں، زبانوں، تمدنوں کے باوجود کسی قسم کے تفرقے کا نام نہیں اور وہ بالکل اسی طرح کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جیسی حکومت فرض کیجئے انگلستان میں ہے؛ ایک دوسرے صاحب آتے ہیں اور باوجودیکہ ملک میں مرکز گریز تحریکات کی طرح مرکز پسند تحریکات ہمیشہ کارفرما رہی ہیں، ملک کے درمیان ایک غیر فطری آہنی دیوار کھڑی کرکے ملک کو ہمیشہ کے لئے دو حصوں میں تقسیم کردینا چاہتے ہیں؛ ایک تیسرے صاحب نمودار ہوتے ہیں اور باوجودیکہ ملک میں ایک یا زیادہ سے زیادہ دو زبانیں

ایسی ہیں جو اکثر و بیشتر حصص ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں، لیکن وہ ان زبانوں کی عالمگیریت کے درپے ہیں اور ملک کو نام نہاد لسانی صوبوں میں تقسیم کرکے ہمیشہ کے لئے غالی اور انتہائی صوبہ واریت کا بول بالا کرنا چاہتے ہیں۔ مشکل سے کوئی ایسا خدا کا بندہ ہوگا جو ہندوستان کے تاریخی پس منظر اور اس کے حقیقی ماحول کا اندازہ کرکے کوئی تعمیری اسکیم پیش کر رہا ہو جس سے مستقبل کی ضمانت ہو سکے۔ ہمارے یہاں سیاسیات کی کیفیت یہ ہے کہ ہم گویا خلا میں اڑنے میں مگن ہیں اور زمین پر پیر رکھنا اپنی توہین تصور کرتے ہیں۔ تاوقتیکہ ملک کی سیاست ملک کے حالات کا آئینہ نہ ہوگی اس وقت تک لڑائی جھگڑے کشت و خون باہمی بے اعتباری بڑھتی ہی جائے گی۔ جب کسی زمانے میں ہماری سیاست ہمارے وطن کے حالات کا آئینہ تھی اس وقت ملک کے مختلف فرقے، شخص اور گروہ ایک دوسرے کے ساتھ ایسے ملے ہوئے تھے جیسے شیر و شکر، یہ بے اعتباری کی فضا اسی وقت پیدا ہوئی ہے جب سے ہم نے اپنے کو خود اپنے آپ سے بیگانہ بنایا ہے۔ ملک کی سیاسی اور معاشری کیفیات میں ایک نہیں بلکہ بیسیوں خلیجیں پیدا ہوگئی ہیں اور ان کا قعر بڑھتا ہی جاتا ہے، یہاں تک کہ تمام ملک کو جو عظیم الشان خطرہ درپیش ہے اس کی طرف سے بھی ہم اپنے آپ کو بے خبر بنائے ہوئے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ ہندوستان کے مسائل کا سب سے زیادہ تاریک پہلو یہ ہے کہ ان کی بنا واقعیت پر نہیں بلکہ نہ معلوم کس نے ہمیں محض نظریہ پرست بنا دیا ہے جس کی وجہ سے ہم روز بروز حقیقت سے دور پھینکے جا رہے ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ دن ہو تو ہم دن کہیں اور رات ہو تو اپنے زعم میں اسے روز روشن

نہ سمجھیں۔ اگر ہم اپنی بقا کے خواہاں ہیں تو ہمیں اپنی تعلیم، اپنی معاشرت، اپنے اخلاق اپنے مذہب، اپنی سیاست، اپنے داخلی اور خارجی تعلقات، سب ہی میں اپنے عزیز وطن اور اس کے حالات کا خیال رکھنا پڑے گا ورنہ اگر ہم نے ملک کی کیفیات کو نظرانداز کیا اور اپنے آپ کو خود اپنوں سے بیگانہ کیا تو ہماری کیفیت چمگادڑ جیسی ہو جائے گی جسے چرند ٹھونگیں مار کر نکالتے ہیں اور پرند منہ نہیں لگاتے۔

ملنے کے پتے

سید عبدالقادر اینڈ سنس تاجران کتب
چارمینار

سید عبدالرزاق تاجر کتب مصطفیٰ بازار
حیدرآباد دکن

مطبوعہ
اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن